مائی ڈارلنگ ہوٹل

مہندرناتھ

نو ہند پبلشرز لمیٹڈ

باراول — اپریل ۱۹۴۹ء

قیمت

دو روپے بارہ آنے

یہ کتاب ناشر نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے چھپوا کر
نو ہند پبلشرز لمیٹڈ ۱۲۱ عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳ سے شائع کیا

فہرست

اُس کے نام

جس نے کہا تھا

"شاید کہ اب وہ پیار کی پہلی نظر نہیں"

کچھ اپنے متعلق

میں آج کچھ اپنے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی اپنے افسانوں کے متعلق۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں خود اپنے افسانوں کی تعریف کرونگا۔ یا میں آپ کو آرٹ اور ادب کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یا آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ترقی پسند ادب یا رجعت پسند ادب کے متعلق ایک لمبی چوڑی تقریر یا ایک عالمانہ، فاضلانہ بحث شروع کرنا چاہتا ہوں۔ جی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے ——— ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے لیکر آج تک جو کچھ ہم پر گذری ہے یعنی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں پر جو کشت و خون لوٹ کھسوٹ۔ بربادی و لاچاری۔ جائیدادوں کا تباہ ہونا۔ غریبوں کا گھروں سے بے گھر ہونا۔ جوان لڑکیوں کی عصمت دری۔ بوڑھی ماؤں کا بھوک اور پیاس سے مرنا۔

ننھے بلکتے بچوں کا روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے مرنا۔ اور ہندو، سکھ اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کا سر پھوڑنا ــــــ یہ باتیں اب اتنی واضح ہو گئی ہیں کہ انھیں بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور اگر اس خون کے بازار سے نکل کر کوئی ادیب یہ کہہ سکتا ہے کہ ادیب ترقی پسند ادب نہ لکھا کریں۔ مذہب، بھوک، بیکاری، حیوانیت، غلامی اور فسطائیت کے خلاف جہاد نہ کیا کریں۔ یا غربت، انسانی کمینگی کے خلاف کہانیاں نہ لکھیں۔ تو میرے خیال میں وہ ادیب یا تو عقل سے بے بہرہ ہے یا اُسے زندگی سے محبت نہیں اُسے صرف موت سے پیار ہے۔ صرف دیوانگی سے رغبت ہے ــــــ

یہ کہانیاں جو آپ پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے۔ یہ بڑے بڑے شہنشاہوں اور جاگیرداروں کے متعلق نہیں۔ یہ کہانیاں میرے اور آپ کے متعلق ہیں۔ یعنی جو کچھ میں نے دیکھا ہے، آپ نے دیکھا ہے۔ اب شہنشاہوں اور جاگیرداروں کا زمانہ گیا۔ اب دور ہے عوام کا، جنتا کا۔ اس دور میں جو کچھ ہم پر گذری ہے یا گذر رہی ہے۔ جو کچھ میں نے برداشت کیا ہے، یا آپ برداشت کر رہے ہیں۔ اور جس زندگی کو میں نے چکھا ہے اور جو زہر میرے جسم اور خون میں سرایت کر گیا ہے۔ اس کی جھلک آپ ان افسانوں میں پائیں گے۔ میں نچلے درمیانی طبقے سے آیا ہوں۔ نچلے درمیانی طبقے کی زندگی مزدوروں اور کسانوں سے زیادہ اچھی نہیں ہوتی۔ صرف چند باتیں ہیں جنھیں وہ دوسروں سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ یعنی انھیں اپنی عزت اور عصمت کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ اور اسی چکر میں وہ ساری زندگی گذار دیتے ہیں۔ اب یہ طبقہ آہستہ آہستہ مزدور طبقے میں جذب ہو رہا ہے۔ چاروں طرف بھوک اور بے کاری بڑھ رہی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں، روپے کی قیمت گھٹ گئی ہے۔ بلیک مارکیٹ، رشوت خوری۔ جھوٹ۔ کمینگی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے

میں نے ان مسئلوں کو بھی افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اور انھیں سلجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ بھوک اور بیکاری کا حل کیا ہے؟ اس کا حل اتنا آسان بھی نہیں۔ اور مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر ہماری حکومت اس طرف متوجہ ہو، تو اس کا حل بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن دکھائی دے رہا ہے کہ ہماری حکومت، ان چیزوں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ وہ بھوک اور بے کاری کے مسئلوں کو حل کرنا نہیں چاہتی۔ فی الحال حکومت نے صرف شراب پینے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ درحالیکہ یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے، جتنا کہ عوام کی بھوک اور ان کی بیکاری ——— جب تک ان مسئلوں کو حل نہ کیا جائے گا۔ اس کرۂ ارض پر امن ناممکن ہے ———

اس مجموعے میں جنسی کہانیاں بھی ہیں۔ یہ کہانیاں ایک شدید جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ میں نے اس جنسی جذبے کو بری طرح محسوس کیا ہے۔ شاید آپ نے بھی کیا ہو۔ کیونکہ ہمارا سماج اتنا گندا اور مکروہ ہو گیا ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات پر اتنی بندش لگا دی گئی ہیں۔ کہ اس جذبے کی صحیح نشوونما نہیں ہو سکتی ——— ہمارے ملک میں جنسی تعلیم بالکل نہیں دی جاتی۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے ایسے موضوعات پر لکھنا پرلے درجے کا احمقانہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ اور متوسط طبقے کی خامیوں کو بے نقاب کیا۔ عورت اور مرد کے جائز اور صحیح تعلقات کو پرکھا۔ صحت مند محبت کے نظریے کو ابھارا۔ جنسی گھٹن کے خلاف جہاد کیا۔ اور زندگی کی نئی قدروں کو اپنے افسانوں میں سمویا۔ گو یہ سچ ہے کہ بہت سے ادیب، جنسی موضوعات پر لکھتے لکھتے بہک گئے۔ اس طرح اصلی مقصد سے پرے ہٹ گئے ——— لیکن کبھی کبھار آدمی بہک بھی جاتا ہے ——— لیکن "صبح کا بھولا ہوا شام کو واپس آ جائے" تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب جب ہم جنسی ادب کو پرکھتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس

جذبے کو شتر بے مہار کی طرح دوڑا نہیں سکتے۔ اور نہ ہی ہم ڈی ایچ لارنس کی طرح، ادب کو صرف جنسی موضوعات کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں ـــــــ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ اس جذبے کو دبانے سے آدمی صحت مند زندگی گذار نہیں سکتا۔ اور صحت مند زندگی گذارنے کے لئے، اقتصادی حالت کا بہتر ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور اقتصادی روکاوٹوں کی وجہ سے چند بندشیں اپنے آپ پر عاید کرنا پڑتی ہیں۔ ان بندشوں کو توڑنا آسان نہیں ہے، کیونکہ یہ بندشیں ہماری سماج میں ہیں۔ اور جب تک ہم اس سماج کو بدلتے نہیں زندگی میں مسرت نہیں آ سکتی۔ زندگی گذر رہی ہے۔ لیکن رکی رکی، جھکی جھکی ـــــــ اس زندگی کا بہاؤ صاف اور ستھرا نہیں ہے۔ اس زندگی میں چاشنی نہیں ہے۔ لطف کم ہے۔ خوشی نہیں ہے، نرمی اور گداز کا نام و نشان نہیں۔ اس زندگی میں تلخی ہے۔ زہر ہے۔ کمینگی ہے۔ لاچاری ہے۔ جھوٹ ہے۔ بھوک ہے۔ بیکاری ہے۔ مکر ہے۔ فریب ہے اور کبھی کبھی خوشی کے چند جھونکے ـــــــ لیکن مجموعی طور پر یاس اور تلخی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ـــــــ

جنسی موضوعات اور اس کے رد عمل کو سامنے رکھ کر میں نے مندرجہ ذیل افسانے اس مجموعے میں شامل کئے۔

"مائی ڈارلنگ ہوٹل"۔ "پھانس"۔ "باپ، بیٹا اور عشق"۔ "روزی"۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

آپ ان افسانوں میں جنسی لذت کہیں نہیں پائیں گے۔ جنسی جذبے کو سماج سے الگ نہیں پائیں گے، اور ساتھ ہی جنسی جذبے کے ساتھ اقتصادی الجھنوں کا بھی ذکر ہے ـــــــ گو ہندستان میں ریلیں ہیں، موٹریں ہیں، بسیں ہیں، ٹرامیں ہیں،

کار ہیں۔ اور ممبئی سے لیکر کشمیر تک اب ہوائی جہاز میں سفر ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری زندگی
میں ابھی تک جمود ہے۔ ابھی تک پرانے توہمات سے وہ آزاد نہیں ہوئی۔ پرانے رسم و
رواج کے اندر ہم مقید ہیں ——— مشترکہ کنبے داری ——— کا رواج ہے۔ ابھی
تک ہماری شادی اپنی مرضی سے نہیں ہو سکتی۔ لڑکیوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت
نہیں۔ مرد اور عورت کے حقوق برابر نہیں ہیں۔ عورت کو ایک حقیر چیز سمجھا جاتا ہے اُسے
محض اس کی عصمت پر خریدا جاتا ہے۔ اور اُسے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس کر کے مردانی
نشاط گاہوں میں بٹھاتا ہے۔ مرد عورت کو روپوں کے ذریعے خریدتا ہے۔ اُسے بیچتا ہے
اور عورت کو صرف جنسی تلذذ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور جب عورت بغاوت کا علم بلند
کرتی ہے، تو اُسے مذہب اور گھر کا واسطہ دیکر چپ کرا دیا جاتا ہے ——— اُسے
یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تم تو گھر کا زیور ہو، تمہارا کام صرف بچے جننا اور بچے پالنا ہے۔ تم مرد کی
برابری کر نہیں سکتیں، تم اپنے حقوق کے لئے لڑ نہیں سکتیں۔ تمہیں اپنے خاوند کو
اپنا خدا سمجھنا پڑے گا۔ چاہے وہ کتنا عیاش اور بدکار ہو تم اسے نہیں چھوڑ سکتیں ——
——— متوسط طبقے میں جب ایک جوان عورت کا خاوند مر جاتا ہے تو اس کے لئے
دوسری شادی کرنا آسان بات نہیں ——— چند عورتیں نکلیں گی۔ جو ان قیود کو توڑ
کر نئی قدروں کو اپنا سکیں، کیونکہ ابھی تک ہم لوگ جہالت اور پرانے رسم و رواج کے
قیود سے آزاد نہیں ہوئے۔ اس لئے ان مسئلوں پر لکھنا بھی اشد ضروری ہے۔ لیکن
ان مسئلوں پر لکھنے سے پہلے ہمیں بنیادی مسائل کو ضرور سوچنا ہوگا۔ کہ اس سماج کی تمام
خرابیاں کس طرح دور ہو سکتی ہیں۔ ایک بہتر زندگی کی کس طرح تنظیم کی جا سکتی ہے ———
جنسی جذبے کو ایک صحیح روپ کس طرح دیا جا سکتا ہے: تاکہ اس جذبے سے ایک

صحیح، صحت مند۔ خوبصورت، توانا زندگی کا آغاز ہو سکے۔

اس صحت مند، خوبصورت اور توانا زندگی کے متعلق آپ ان افسانوں میں اشارے پائیں گے۔

لیکن جنسی جذبے کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے، جو جنسی جذبے سے زیادہ اہم ہے کہ جب تک اس مسئلے کو حل نہیں کیا جائے گا۔ ایک بہتر زندگی کا آغاز اس ہندوستان میں نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مسئلہ دو چار آدمیوں کا نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہے، اور اب جب کہ ہندوستان سے گوروں کی حکومت چلی گئی ہے، اور ہندوستان میں ہندوستانیوں کا راج ہے، تو اس وقت ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ ہم ایک بھرپور زندگی کے لئے جدوجہد کریں، ایک ایسے نظام کی تشکیل کریں۔ جہاں نہ غربت ہو، نہ بیکاری ہو، نہ ظلم ہو، نہ بربریت ہو، جہاں ہر شخص کو کام مل سکے، اور اُسے اپنی محنت کا پورا معاوضہ ملے، جہاں سرمایہ دار مزدور کی محنت سے محل نہ تعمیر کر سکے، بلکہ ایسے نظام کی تعمیر ہو، جہاں محنت کش طبقہ برسرِ اقتدار ہو۔۔۔۔۔۔ تو اس قسم کے ادب کو پیدا کرنا آسان بات نہیں، کیونکہ ہمیں صرف مزدوروں کے مسائل کو جاننا ہی نہیں ہے، ہمیں مزدوروں اور کسانوں کی زندگیوں سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے جبھی ہم افسانوں اور ناولوں میں انھیں سمو سکیں گے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے، کہ کسان اور مزدور کس طرح سوچتا ہے، کس زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ مختلف موضوعات پر اس کے کیا رجحانات ہیں۔ وہ کس طرح محبت کرتا ہے۔ کیا اس کی محبت میں بھی گھٹن ہے۔ کیا وہ عزت اور عصمت کو اتنا ہی عزیز سمجھتا ہے، جتنا کہ متوسط طبقے والے ۔۔۔۔۔۔ مزدور اور کسان کی کیا مانگیں ہیں ۔۔۔۔۔۔ وہ کس طرح کے بنے ہوئے گھروں میں رہتے ہیں،

وہ کیا کھاتے ہیں، وہ کیا پہنتے ہیں۔ ان کے خواب کیا ہیں۔ وہ کیسی زندگی کو اپنانا چاہتے ہیں۔ یہ سب باتیں اُن سے مل بیٹھ کر ہم جان سکتے ہیں۔ صرف سطحی طور پر ان کی زندگیوں پر نظم لکھ دینا۔ یا افسانہ لکھنا اب کافی نہ ہوگا۔ ہمیں ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو پہچاننا ہوگا۔ اُن کے کردار کو سمجھنا ہوگا۔ اس کے رول کو بخوبی جاننا ہوگا۔ جبھی جاکر ہم ایک اچھے ادب کی بنیاد رکھ سکیں گے۔

آجکل ترقی پسندی تقریباً "فیشن" بن چکی ہے۔ اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ ہم لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو بتائیں کہ صحیح ترقی پسند ادب کون سا ہے۔ محض مزدوروں اور کسانوں کا ذکر کرنے سے ادیب ترقی پسند نہیں بن جاتا۔ سطحی جذباتی ہمدردی کا اظہار کرنے سے ادیب ترقی پسند نہیں بن جاتا۔ بلکہ ترقی پسند ادیب میں ایک گہرائی چاہئیے ایک سنجیدگی چاہئیے۔ دشمنوں کی طاقت کو سمجھنے کی صلاحیت چاہئیے۔ اس کا دل اتنا بڑا ہو کہ وہ اس پھیلی ہوئی زندگی کو سمجھ سکے۔ اور اپنے ادب میں اُسے سمو سکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادیبوں کا یہ بھی فرض ہے، کہ وہ جان پہچان لیں، کہ اس وقت دنیا کدھر جا رہی ہے، موجودہ مسائل کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔ اور موجودہ مسائل کو حل کرنے میں کونسا طبقہ آگے بڑھنے والا ہے۔ وہ کون سا طبقہ ہے، جو انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ وہ کون سا طبقہ ہے، جو انقلاب کا راہ نما بن سکتا ہے۔ اب جب کہ اشتراکیت، روس سے ہوتی ہوئی برما کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ تو ہندوستان میں رہنے والے ادیب کس طرف نگاہ اٹھائیں گے۔ ان کا کیا فرض ہے۔ کیا وہ انقلابی تحریکوں کا ساتھ دیں گے، یا رجعت پسند طاقتوں کا۔

اس وقت آدھی دنیا سے زیادہ حصہ پر اشتراکیت کا بول بالا ہے۔ اور جہاں اشتراکیت

نہیں ہے، وہاں بھوک ہے، بیکاری ہے، بلیک مارکیٹ ہے، چیزوں کی قیمتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ سرمایہ دار مزدور کا خون چوستا ہے، فسطائیت کا دور دورہ ہے۔ ——— مذہب کا نام لے کر انسانیت کو ختم کیا جا رہا ہے۔ تو ان حالات میں اگر ترقی پسند ادیب اشتراکیت کا ساتھ نہ دیں گے، تو کیا کریں گے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے اشتراکیت کا ساتھ دینا اور بات ہے، اور اچھا اشتراکی مارکسی ادب پیدا کرنا اور بات ہے ——— ادیب کو صرف ترقی پسند ہی نہ ہونا چاہئے، بلکہ اس کے لئے ایک اچھا ادیب ہونا بھی لازمی ہے، اسی لئے میں ان ادیبوں کی قدر کرتا ہوں، جو صرف ایک خوبصورت پھول، ایک حسین عورت، آسمان پر بھاگتے ہوئے بادلوں، صاف اور شفاف جھرنوں خوبصورت نیلا آسمان، صاف اور شفاف جھیل، عورت اور مرد کی محبت پر، چاند سورج اور تاروں پر خوب صورت افسانے لکھتے ہیں۔ کوئی اچھی چیز لکھنا آسان بات نہیں ہے۔ چاہے وہ نظم مزدور پر ہو یا ایک حسین پھول پر ——— ہمیں ہمیشہ ایک ادیب کو مجموعی طور پر پرکھنا چاہئے۔ اس کی چند نظمیں یا افسانے پڑھ کر اس کو گالی دینا ترقی پسندی نہیں۔ ہر ادیب میں خامیاں بھی ہوتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ نقاد کا فرض ہے کہ وہ دونوں پہلوؤں کو بے نقاب کرے۔ اگر مجموعی طور پر اس کی زندگی کا نظریہ صحت مندانہ ہے تو وہ واقعی قابل غور ادیب ہے۔ اگر مجموعی طور پر اس کی زندگی کا نظریہ غیر صحت مندانہ ہے۔ تو اس ادیب پر کڑی نظر رکھنی چاہئے۔

کچھ اسی قسم کے جذبات سے متاثر ہو کر میں نے "نئے لوگ" لکھی ہے، اس میں صاف بتایا گیا ہے کہ اب مزدور اپنی انقلابی حیثیت پہچانتا ہے۔ وہ رحم اور ہمدردی کا قائل نہیں۔ وہ سرمایہ داروں سے بھیک مانگنا نہیں چاہتا۔ وہ کسی شخص کی اس لئے

عزت نہیں کرنا چاہتا کہ اس کے پاس بہت روپیہ ہے، یا ایک کار ہے، یا چار کوٹھیاں ہیں۔ کیوں کہ اُسے معلوم ہوگیا ہے کہ روپیہ کیسے کمایا جاتا ہے۔ نفع کیوں لیا جاتا ہے، یہ محل کس طرح تیار ہوتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی کوٹھیاں کیسے بنتی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ موجودہ تجارت محض لوٹ کھسوٹ ہے۔ محض چوری ہے، ڈاکہ ہے، راہ زنی ہے۔ اس لئے اس کے دل میں سرمایہ دار کی کوئی عزت نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ مزدور محنت کرتا ہے۔ کارخانے وہ چلاتا ہے۔ کھیت میں ہل وہ چلاتا ہے۔ گیہوں وہ اُگاتا ہے۔ اور اس کی جگہ اسے بھوک ملتی ہے۔ بے کاری ملتی ہے۔ اس کے بچے بھوکے رہتے ہیں۔ تیمارداری کے لئے اس کے پاس روپے نہیں ہوتے۔ تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے نہیں ہوتے۔ اُسے اب اپنی انقلابی حیثیت کا علم ہوگیا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ میں ایک خوداعتمادی کا جذبہ آگیا ہے۔ یہ جذبہ پہلے مفقود تھا۔ یہ حال کی انقلابی تحریک کا پیدا کردہ ہے۔

اسی طرح اس مجموعے میں اور کہانیاں ہیں۔ مثلاً ——— "نیا بھکاری"۔ "صرف ایک کامریڈ"۔ "صرف تین خط"۔ جن میں زندگی کے اُن ناسوروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو موجودہ نظام کو گھُن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ اور جب تک ان ناسوروں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کی چیر پھاڑ نہیں ہوتی۔ ایک بہتر، صحت مند زندگی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے، کہ ہر ادیب انسانیت کا جھنڈا بلند کرے۔ یہ وہ نازک دور ہے، جہاں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ جہاں زندگی کی جگہ موت کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ جہاں جمہوریت کی جگہ فاسیت کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ جہاں شرافت کی جگہ کمینگی کو سراہا جا رہا ہے

جہاں خوب صورتی کی جگہ بدصورتی کو اپنایا جارہا ہے۔ اور اس وقت ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس بگڑی ہوئی زندگی کو سنواریں۔ اور ایک صحت مند، توانا، اور خوبصورت زندگی کی بنیاد رکھیں۔

مہندر ناتھ
بمبئی، ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء

نیا بھکاری

اُس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، جب میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اور سیدھا ایرانی ریستوران میں پہنچا۔ ریستوران تقریباً خالی پڑا تھا، میں جلدی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میز پر پڑے ہوئے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اخبار پرانا دکھائی دیتا تھا، معلوم نہیں اتنا پرانا اخبار میز پر کیوں رکھا ہوا تھا۔ میں اخبار سے نظر ہٹا کر چلایا "بوائے"

ایک لڑکا میرے قریب آیا

"ایک کپ سنگل چائے اور کچھ بسکٹ"

لڑکے نے یہ آواز سنی اور چلا گیا۔

میں پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ قریب ایک آواز آئی۔ "مسٹر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان خبروں پر اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ کبھی لکھتے ہیں کہ ہٹلر مارا گیا۔ کبھی لکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں کچھ عرصے سے بیکار ہوں"

بات کرنے والے نے اس چابک دستی سے پینترا بدل دیا تھا، کہ مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑا۔ میں نے چھچلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ نوجوان داہنے ہاتھ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا۔ بات یوں ہے کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا دراصل میں کھانا چاہتا ہوں۔ لیکن روٹی نہیں ملتی۔ آپ میری بات نہیں سمجھے —— شاید آپ میری بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے —— خیر۔ میں جب سے پیدا ہوا ہوں، بیکار ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں، کہ میں نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ میں نوکری تلاش کر چکا ہوں —— میں دفتروں میں، فرموں میں، گورنمنٹ آفسوں میں، پرائیوٹ فرموں میں، ملوں اور ڈپوں میں —— تقریباً ہر جگہ جا چکا تھا —— نوکری کے لئے ہاتھ پھیلائے ہیں۔ لوگوں کی منتیں کی ہیں —— لیکن بدقسمتی سے نوکری نہیں ملتی —— شاید آپ سمجھتے ہوں کہ میں ان پڑھ ہوں۔ نہیں صاحب نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں پڑھا لکھا ہوں۔ میں انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں اردو۔ ہندی لکھ سکتا ہوں بول سکتا ہوں۔ میں دفتر میں کام کر سکتا ہوں۔ لیکن اس دنیا کا کوئی انسان مجھ پر رحم نہیں کھاتا۔ مسٹر بات یہ ہے کہ آپ کہاں کام کرتے ہیں۔

دیکھیے، جھوٹ نہ بولئے۔ اب میں آپ کی شکل دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔ کہ آپ کس فرم میں نوکر ہیں۔ آپ کی جیب میں کتنے روپے ہیں۔

'کیا آپ جوتشی ہیں'۔ میں نے ذرا غصے میں کہا

'جی نہیں۔ میں جوتشی نہیں، عامل نہیں ——— اور یہ تو سیدھی سادی بات ہے۔ اگر روپے آپ کے پاس نہ ہوتے، تو آپ ریستوران میں کس طرح آتے اور چائے کا آرڈر کس طرح دیتے ——— جی ہاں۔ بتایئے نا۔ آپ کسی دفتر میں نوکر ہیں'؟

میں تذبذب میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ فوراً ہی مجھے یہ جواب سوجھا: 'بھائی میں خود بیکار ہوں'۔

'ارے صاحب، میں چور نہیں، ڈاکو نہیں، رہزن نہیں، سیاست داں نہیں، لیڈر نہیں۔ بات یوں ہے مسٹر کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا میں آپ سے پیسے نہیں مانگتا۔ اگر آپ کی جیب میں پیسے نہ ہوں تو نہ دیجیے، میں عام بھکاریوں کی طرح آپ کو تنگ کرنا نہیں چاہتا ——— دراصل میں بھکاری نہیں۔ مجھے خود بھکاریوں سے نفرت ہے۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ دیکھ لیجئے۔ کانا نہیں، گنجا نہیں، میرے ہوش و حواس ٹھیک ہیں میرے دو بازو ہیں، دو آنکھیں ہیں۔ دل جگر، گردہ، پھیپھڑے نہایت اچھی طرح کام کرتے ہیں۔ اور اس لئے خوب بھوک لگتی ہے، پیٹ میں کبھی درد نہیں ہوتا۔ پاگل پن کا کبھی دورہ نہیں پڑتا۔ دراصل میں کبھی بیمار نہیں ہوا۔ اگر بیمار ہو جاتا، تو کب کا مر گیا ہوتا، جب ایک وقت کے کھانے

کے لئے پیسے نہیں ہوتے، تو دوائی کے لئے پیسے کہاں سے آجائیں گے
خیر۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا ——— آپ چائے کیوں نہیں پیتے۔ آپ نے
ہٹلر کی موت کی خبر پڑھ لی ہوگی، کہتے ہیں، ہٹلر بڑا آدمی تھا ——— ہوگا
——— بڑا آدمی کون ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا۔ اس دنیا میں سوچنا
اور سمجھنا بے کار ہے ——— ہٹلر بیچارا مرگیا ——— لیکن اس کی موت کا مجھ
پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب وہ تمام یورپ پر قبضہ کر چکا تھا، تب بھی میں اسی
طرح تھا۔ جب وہ سپاہی تھا، تب بھی میں اسی طرح تھا۔ جب وہ ایک
مصور تھا تب بھی میں اسی طرح تھا۔ اور اب جب کہ وہ مرگیا ہے۔ تب بھی
میں اسی طرح ہوں۔ یعنی اس کی موت کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لوگ کہتے
ہیں ہٹلر جابر تھا۔ وحشی تھا۔ انسانیت کا دشمن تھا۔ وہ تمام دنیا پر قبضہ
کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس نے دنیا کے کافی حصے پر قبضہ کر لیا تھا ——— مگر ان
باتوں کے باوجود میری حالت اسی طرح رہی ——— لڑائی سے پہلے بھی
میں بیکار تھا۔ اور لڑائی کے بعد بھی میں بے کار ہوں ——— آپ میری
طرف گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں، کیا آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں
آپ میرے ساتھ چلئے۔ میں آپ کو رائل ایر فورس کا رجسٹر دکھاتا ہوں،
میں پائیلٹ بننا چاہتا تھا۔ لیکن ڈاکٹروں نے میری نظر کمزور بتائی، آپ
ہی بتائیے، کہ میں کیا کرتا۔ اور اسی طرح اور دفتروں میں بھی گیا۔ کسی نے کہا،
تمھارا قد چھوٹا ہے۔ پھیپھڑے خراب ہیں، بات کرنے کی تمیز نہیں، کوئی
کہتا تھا۔ تم باتیں زیادہ کرتے ہو، لوگوں کو الو بناتے ہو، خدا کی قسم۔ میں

نہایت شریف انسان ہوں، کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ صاف صاف باتیں کرتا ہوں۔ کسی سے دنگا فساد نہیں کرتا۔ زندگی نہایت آرام سے گذارنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا بتاؤں، آرام نہیں ملتا ——— ہاں میں کہہ رہا تھا ——— میرا مطلب ہے ——— مسٹر، آپ کا نام کیا ہے'

'جی، میرا نام ——— میرا نام گجندر کمار ہے'۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

'آپ جھوٹ بول رہے ہیں'

'کیا مطلب آپ کا'

'یعنی آپ کا نام گجندر کمار نہیں'

'تو پھر آپ ہی بتایئے، میرا نام'

'آپ کا نام، نریندر ناتھ ہے'

'آپ کو کس طرح معلوم ہوا'۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا

'کوئی بات نہیں۔ میں ان چیزوں کا عادی ہوں'

''لیکن میرا نام آپ کو معلوم کس طرح ہوا''۔ میں نے ذرا خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

'آپ کے دائیں بازو پر کھدا ہوا ہے'

'اوہ معاف کیجئے۔ دیکھئے۔ غلطی ہوئی۔ دراصل ——— میں ——— میں ———'۔

میں کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔ اور الفاظ شرم کے مارے حلق میں

اٹک سے گئے۔ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

میں آپ کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ آپ خفیف کیوں ہوئے جا رہے ہیں۔ میں ہر شخص کا مطلب سمجھ جاتا ہوں ——— اگر آپ شریف نہ ہوتے تو میں آپ کے قریب کبھی نہ آتا۔ میں آدمیوں کی سیرت، ان کی صورت سے پہچان جاتا ہوں۔ اس ریستوران میں اور بھی آدمی چائے پی رہے ہیں لیکن میں ان کے قریب نہ گیا۔ میں آپ کے پاس کیوں چلا آیا۔ اس کی وجہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ آپ شریف ہیں، عقلمند ہیں، سمجھ دار ہیں، دیانتدار ہیں۔ اس لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ مگر، اس کا یہ مطلب نہیں، کہ آپ مجھ کو دیکھ کر گھبرا جائیں ——— تو ہاں۔ میں ہٹلر کا ذکر کر رہا تھا۔ مگر مسولینی کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا ——— لوگ کہتے ہیں۔ کہ مسولینی مارا گیا ——— مارا گیا۔ یا مر گیا۔ یا مار دیا گیا۔ ان تینوں فقروں میں کافی فرق ہے، فرق کی اس وقت اہمیت ہوتی ہے۔ جب لوگ اس فرق کو جاننے کی کوشش کریں ——— خیر جانے دیجئے۔ اگر لوگوں کو اس فرق کے جاننے کی خواہش نہیں۔ آرزو نہیں۔ تو مجھے کیوں ہو۔ آپ کو کیوں ہو ———

دیکھئے، مسٹر۔ آپ چائے کیوں نہیں پیتے۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیا ان لوگوں کا لوہا مانتی تھی۔ انھیں پیغمبر سمجھتی تھی۔ عوام انھیں پوجتے تھے، تعریفیں کرتے تھے۔ دنیا کا بہترین انسان تسلیم کرتے تھے۔ کتنا شاندار ماضی تھا ان کا ——— ہر شخص کا ماضی شاندار ہوتا ہے۔ میرا بھی تھا۔ وہ وقت مجھے یاد ہے۔ جب میں اپنی ماں کی گود میں کھیلا کرتا تھا۔ اور ماں

مجھے لوریاں دے کر سلاتی تھی۔ لیکن باپ کی میں نے شکل نہیں دیکھی۔ میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی ماں سے کبھی نہ پوچھا۔ کہ میرا باپ کہاں ہے۔ وہ کیوں نہیں آتا۔ لوگوں نے مجھے بتایا، کہ میرا باپ میری ماں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا گیا تھا ۔ ہاں۔ میں اُن دنوں کا ذکر کر رہا تھا۔ جب ماں مجھے بسکٹ کھلاتی تھی۔ مجھے ہر روز نہلاتی ۔ اچھے اچھے کپڑے پہناتی ۔ اور جب کبھی میں گھر سے باہر چلا جاتا۔ تو وہ میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ جب گھر واپس آتا۔ تو وہ مجھے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ میرا منہ چومتی، اور مجھے مٹھائی کھلاتی، لیکن وہ زمانہ بہت جلد بیت گیا۔ زندگی میں صرف ایک عورت نے پیار کیا۔ صرف ایک عورت نے میرے منہ کو چوما۔ اور وہ میری ماں تھی ــــــ اس کے بعد کیا ہوا میں نہیں جانتا ــــــ ماں کیوں مر گئی ــــــ میں یتیم خانے میں کیسے چلا آیا۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ اس یتیم خانے میں ۔ میں پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔ اور سڑکوں پر آوارہ گھومنے لگا۔ آوارگی میرے خون کے ذرے ذرے میں سما چکی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سڑکوں پر آوارہ گھومتا رہوں ــ اور گھومتا رہوں، یا ریستوران میں بیٹھ کر کسی سے باتیں کرتا رہوں۔ وہ شخص چائے پیتا رہے، اور میں اس کی طرف دیکھتا رہوں۔ صرف اس بات کی امید کرتے ہوئے، کہ ابھی وہ شخص میرے لئے بھی چائے کا آرڈر دے گا ــــــ مسٹر معاف کیجئے گا ۔ میرا مطلب آپ سے نہیں، بلکہ اُس شخص سے ہے، اُس انسان سے ہے، جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ میں جس کے انتظار میں آوارہ پھرتا ہوں۔ جس کی تلاش میں میرے پاؤں کی جوتی گھس گئی ۔ پاجامہ پھٹ گیا ــــــ اور آج میری جیب

خالی ہے —— میری جیب کیوں خالی ہے، اس کا مجھے افسوس نہیں، کیونکہ میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔ دنیا میں دو قسم کے انسان رہتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کی جیبیں بھری ہوتی ہیں۔ اور ایک وہ، جن کی جیبیں خالی ہیں —— دیکھئے —— مسٹر۔ شاید آپ سوچ رہے ہیں، کہ میں سوشلزم پر تقریر کروں گا۔ ابھی میں مئی ڈے کے لئے ایک جھنڈا نکالوں گا۔ اور آپ سے دو آنے طلب کروں گا —— نہیں صاحب نہیں —— میں جھنڈے نہیں بیچتا نہ آزادی کے۔ نہ غلامی کے، نہ سرخ، نہ سفید، نہ ترنگے، نہ چاند مارکہ —— میں جھنڈوں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ دیکھا آپ نے ان لوگوں کا حشر، جو جھنڈوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ہٹلر نے سواسٹکا جھنڈا بلند کیا۔ جرمن قوم اس کے پیچھے بھاگی۔ مسولینی نے ماسیت کا جھنڈا بلند کیا۔ اٹلی کے لوگ شور و غل مچاتے ہوئے جھنڈے کے پیچھے بھاگے، اور پھر صاحب۔ ہندستان اور یہ پاکستان۔ ایک طرف گاندھی ٹوپی، اور دوسری طرف جناح کیپ ایک طرف ہندو، دوسری طرف مسلمان —— ایک طرف گیتا، دوسری طرف قرآن۔ ایک طرف ترنگا جھنڈا۔ دوسری طرف چاند مارکہ جھنڈا، ایک طرف اکھنڈ ہندستان، دوسری طرف پاکستان —— اور پھر کیا ہوا، لوگ پاکستان اور ہندستان کی طرف بھاگنے لگے۔ نہ جھنڈا رہا نہ مسولینی، اور نہ بھاگنے والے، جھنڈے کو پھاڑ دیا گیا۔ مسولینی کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ ہندستان کے سب سے بڑے نیتا کو گولی مار دی گئی —— لوگوں کا کیا حشر ہوا۔ لاکھوں انسان گھر سے بے گھر ہوئے، ہزاروں نوجوان مارے

گئے۔ گھروں کو جلایا گیا۔ عصمتیں لٹیں، زمینیں تباہ ہوئیں۔ بھوک، بیکاری اور کمینگی بڑھ گئی۔ زندگی زیادہ بھیانک، اور گھناؤنی ہو گئی ــــــ آپ مسکرا رہے ہیں۔ مسکرائیے صاحب، ضرور مسکرائیے ــــــ آپ کو حق حاصل ہے مسکرانے کا۔ میں اس مسکراہٹ کی وجہ بھی سمجھتا ہوں۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ میری باتوں میں گہرائی نہیں ــــــ میں نے کب کہا کہ میری باتوں کو کتابی صورت میں پیش کیا جائے، میں نے کب کہا۔ کہ میری باتوں کو اشوک کے کتبوں کی طرح جابجا نصب کیا جائے۔ میں نے کب کہا۔ کہ میری باتوں کو ریڈیو سے براڈکاسٹ کیا جائے، تاکہ دنیا کے لوگ میری باتوں سے مستفید ہو سکیں۔ میں عالم نہیں، فاضل نہیں، فلسفی نہیں، دنیا کے تین بڑے انسانوں میں سے ایک بھی نہیں، صرف ایک انسان ہوں۔ نہایت سیدھی سادی باتیں کرتا ہوں۔ اور باتیں اس لئے کرتا ہوں کہ کبھی کبھی باتیں کرنے کے لئے جی چاہتا۔ اور اس وقت جی چاہتا ہے۔ کہ کچھ کھاؤں۔

پیسٹری کے متعلق آپ کا خیال ہے۔ آج کل پیسٹری اچھی نہیں ملتی ــــــ جنگ سے پہلے نہایت ہی لذیذ پیسٹری ملتی تھی، اور کبھی کبھی جی چاہتا ہے (ایک عورت کی طرف اشارہ کر کے، جو ابھی ریستوراں میں داخل ہوئی تھی، دیکھ لیں نا آپ نے اس کی ٹانگیں۔ بالکل نیا اور تازہ مال ہے عورت ہے اور کچھ نہیں ــــــ جی چاہتا ہے کہ ان ٹانگوں سے لپٹ جاؤں ــــــ کیا خیال ہے، آپ کا مسٹر ــــــ اور ان سفید سفید

مرمریں ٹخنوں کو چوم لوں ——— ایک بار میں نے اس قسم کی حرکت کی تھی۔ شاید آپ نے بھی کی ہو گی ——— پہلے آپ میرا قصہ سنئے۔ اور اگر مجھے فرصت ہوئی، تو میں آپ کا افسانہ بھی سن لونگا۔ نہایت چھوٹا سا افسانہ ہے میرا۔ یہ لیلےٰ مجنوں کا قصہ نہیں۔ شیریں فرہاد کا قصہ نہیں، ہیر را نجھے کی حکایت نہیں۔ میرا اپنا قصہ ہے۔ ایک بار میں بازار سے گذر رہا تھا۔ کہ سامنے سے ایک لڑکی گزری، اسے دیکھ کر میں بے قابو سا ہو گیا۔ اور میرے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت چھا گئی۔ یعنی میں کچھ بتا نہیں سکتا، کہ مجھ پر کیا گذری دوسرے لمحے میں اس کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، کچھ بتا نہیں سکتا۔ جب آنکھ کھلی، تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ سارے جسم میں درد ہو رہا تھا، اور سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر مجھے بتایا گیا۔ کہ میں نے نہایت ذلیل حرکت کی تھی ——— اخلاق سے گری ہوئی ——— اخلاق کیا ہوتا ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن مجھے اس حرکت کا افسوس ہے۔ میں خود نادم ہوں، شرمندہ ہوں۔ اپنے آپ کو کوستا ہوں۔ گالیاں دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ اس قسم کی کبھی کوئی حرکت نہیں کی۔ لیکن جب کبھی اس بازار سے گذرتا ہوں۔ تو لوگ مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں، چھیڑتے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں، آپ ہی بتائیے۔ کہ ان قہقہوں کا کیا جواب ہے میرے پاس۔ میرے پاس تو کسی بات کا جواب نہیں۔ میں تو سوال کرتا ہوں، جواب دینا آپ کا فرض ہے۔ آپ خاموش کیوں ہیں ——— مسٹر آپ یہ بتائیے، کہ آپ رہتے کہاں ہیں ——— اس بار جھوٹ نہ بولئے، اگر

اس بار آپ جھوٹ بولے۔ تو میں کچھ نہ کرسکوں گا۔ میں آپ کے مکان کا پتہ اور نام بتانے سے رہا ——— میں آپ کی رہائش کی جگہ نہیں جانتا۔ نام تو میں نے آپ کا بتا دیا تھا۔ کیونکہ آپ کے داہنے بازو پر کھدا ہوا تھا۔ اور میں آپ کے قریب اس لئے بیٹھا تھا۔ کہ میں نے آپ کے بائیں ہاتھ میں ایک روپیہ کا نوٹ دیکھ لیا تھا ——— میں آپ سے روپیہ نہیں مانگتا۔ خدا کی قسم نہیں مانگوں گا۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا ——— میں جانتا ہوں کہ آپ خود ہی مجھے چند آنے دیں گے۔ چند آنے نہیں ——— تو چند پیسے، اگر چند آنے یا چند پیسے مجھے دیں گے، تو آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔ دنیا کا ہر شخص چند ٹکے دوسرے شخص کو دے، تو زندگی اتنی بے کیف نہ ہو۔ صاف ظاہر ہوا کہ کسی کو چند ٹکے دینا، نیکی ہے، ثواب ہے ——— میں خیرات کے حق میں نہیں۔ ایک اور طریقے سے میں آپ سے پیسے لے سکتا ہوں۔ یعنی زبردستی ——— میں آپ کا سر پھوڑ سکتا ہوں، آپ کی ٹانگ توڑ سکتا ہوں، آپ کی گردن مروڑ سکتا ہوں۔ لیکن کیا فائدہ۔ چند آنوں کے لئے جیل میں چلا جاؤں گا ——— اوں ہوں۔ یہ کبھی نہ ہوگا۔ اتنا بیوقوف نہیں ——— اور آپ سے پیسے لینا میں اپنا حق سمجھتا ہوں ——— حق اس لئے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ عجیب سی خواہش ہے۔ ابھی تک مرنے کی تمنا پیدا نہیں ہوئی۔ اتنی بے کاری، بھوک اور لاچاری کے بعد، زندہ رہنے کی خواہش ہے ——— کیوں کیا خیال ہے آپ کا۔ آپ کچھ سوچ رہے ہیں۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں۔ کہ روپیہ میں

سے آپ کو کتنے پیسے بچیں گے،

ٹھیرئیے، اس روپیہ کا حساب میں بتاتا ہوں، گو حساب میں ہمیشہ فیل ہوتا تھا لیکن اس وقت میں چوک نہیں سکتا۔ مجھے آپ کے روپیہ کے سولہ آنوں کا پورا حساب یاد ہے۔ جب بھوک جسم کے ذرے ذرے میں سما جائے تو حواس خمسہ تیز ہو جاتے ہیں۔ ذہن میں بلا کی تیزی اور قوت آ جاتی ہے۔ اس وقت ایک ایک آنہ ذہن میں کیل کی طرح گڑا ہوا ہے۔ وقت کیا ہے، ساڑھے بارہ ——— میں ہر روز دس بجے چائے پیتا تھا۔ وقت کا بہت پابند ہوں۔ اور آج ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ چائے کا ایک گھونٹ نہیں پیا ——— تو ہاں میں کہہ رہا تھا۔ کہ آپ نے شروع میں ایک چائے اور کچھ بسکٹوں کا آرڈر دیا تھا۔ لیکن چائے اور بسکٹوں کے ختم ہونے کے بعد آپ نے ایک سوڈا منگوایا ڈیوک کا سوڈا۔ اور ساتھ کچھ پیسٹریاں۔ دراصل میں باتیں کرتا رہا۔ اور آپ کھاتے رہے۔ ایک چائے اور ایک سوڈا۔ کتنے ہوئے پیسے۔ صرف تین آنے ——— اور اس دوران میں آپ نے کتنی پیسٹریاں کھائیں اور کتنے بسکٹ۔ اس کا آپ کو علم نہیں۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ بیرہ بھی بتا سکتا ہے۔ اور شاید یہ ایرانی بھی۔ جو اس ریستوران کا مالک ہے۔ کافی عرصے سے میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ جیسے میں نے اس کی جائداد پر قبضہ کر لیا ہے۔ کمینہ کہیں کا۔ تو ہاں۔ میں یہ بتا سکتا ہوں، کہ آپ نے کس وقت بسکٹ کا آرڈر دیا تھا۔ اور کس وقت پیسٹریوں کا۔ آپ کو علم نہیں ——— علم اس لئے نہیں۔ کہ آپ میری باتیں سن رہے تھے، اور ساتھ ہی پیسٹریاں اور

بسکٹ کھا رہے تھے۔ اور بہت جلدی جلدی ـــــ مگر ہر پیسٹری اور ہر بسکٹ جو آپ کھا رہے تھے، اس کی مٹھاس، اس کی خوشبو، میری ناک کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی، میری زبان بار بار اس مٹھاس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی ـــــ تو مسٹر آپ نے تین پیسٹریاں کھائیں۔ اور بارہ بسکٹ، کل کتنے پیسے ہوئے۔ بارہ آنے۔ اور ایک سوڈا اور ایک چائے، صرف تین آنے، تو کل پندرہ آنے ہوئے۔ باقی کیا بچا۔ صرف ایک آنہ۔ صرف ایک آنہ مسٹر۔ اور میں ایک آنے کے لئے آپ کے آگے کیوں ہاتھ پھیلاؤں اور میں پھر یہ کہوں گا ـــــ میں عالم نہیں، فاضل نہیں، فلسفی نہیں، لیڈر نہیں چور نہیں، ڈاکو نہیں، جیب کترا نہیں۔ صرف ایک انسان کی حیثیت سے یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ صرف ایک آنے کی چائے منگوایئے۔

بیرہ۔ ایک سنگل چائے فوراً، میں نے کرخت لہجے میں کہا

اور بیرہ چائے کا پیالہ لایا۔ بولنے والے کی نگاہیں اُس پیالے پر مرکوز ہوگئیں۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے پیالے کو پکڑا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اُس نے ایک جھٹکے سے پیالے کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور ایک ہی گھونٹ میں پیالے کو خالی کر دیا، چائے گرم تھی، ضرور گرم ہوگی، کیا کیا اس کا ہونٹ اور گلا نہ جلا ہوگا۔

"شکریہ، مسٹر شکریہ"۔ اور وہ مسکراتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

میں کاؤنٹر پر ایرانی کو پیسے دینے لگا۔ تو ایرانی نے مسکراتے ہوئے کہا "لوٹ لیا نا چھوکرے نے آپ کو۔ حرام خور ہر روز اسی طرح کرتا ہے
میں نے پیسے دیئے۔ اور کچھ کہے بغیر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

۳۳

پھانس

پنڈت جی، جب فلمی دنیا میں وارد ہوئے۔ تو ان کی زندگی کے اصول معین اور واضح ہو چکے تھے۔ وہ فلمی دنیا کی گہرائیوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور فلمی تیتریوں اور خوبصورت ایکٹرسوں کے معاشقوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے، کہ فلموں میں کام کرنے والے، عشق، شراب، اور ریس سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ شاید دو ایک اداکار ایسے ہوں جو ریس نہ کھیلتے ہوں، یا شراب نہ پیتے ہوں، یا عشق نہ فرماتے ہوں، ورنہ باقی سب اسی دھندے میں لگے

ہوئے ہیں۔ یہ تینوں چیزیں اداکاروں کے لئے لازمی ہیں۔ جو ایکٹر خوب رئیس کھیلے، جی بھر کر شراب پیئے، اور نت نئی لڑکی پھانسے، وہ سب سے اعلیٰ اداکار، سب سے بڑا آرٹسٹ۔ اس کی اسٹوڈیو میں بہت عزت ہوتی ہے، پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اُسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ اور بار بار پکچروں میں کام دیتے ہیں لیکن پنڈت جی کو یہ باتیں پسند نہ تھیں۔ وہ اس ماحول کو بہتر بنانا چاہتے تھے، انھوں نے قسم کھائی تھی، کہ وہ ان باتوں کے نزدیک نہ جائیں گے، اپنا کام کریں گے، اور اس طرح فلمی حلقوں میں اپنا نام پیدا کریں گے۔ عشق، شراب، اور ریس، زندگی کی لعنتیں ہیں۔ اس سے جسم اور روح دونوں پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا جسم اور اپنی روح کو پاک اور صاف رکھیں گے۔ عورت کی ترچھی نگاہوں کے گھائل نہ ہوں گے۔ عورت کے گھنے، سیاہ بال، اس کا شفاف اور بلوریں جسم، اس کی ہوسناک نگاہیں، اس کا چھل کپٹ، اس کی دلفریب مسکراہٹ ان کی زندگی پر اثرانداز نہ ہوں گی۔ پنڈت جی نے اپنی فلمی زندگی اسسٹنٹ ڈائرکٹری سے شروع کی، کیونکہ وہ ڈائرکٹر بننا چاہتے تھے۔

× × × × ×

اور یہ واقعی عجیب سی بات ہے، کہ پنڈت جی نے تھوڑے عرصے میں نام پیدا کر لیا۔ گو وہ اس طرح روپے نہ جمع کر سکے، لیکن ان کے کیریکٹر کی سارے اسٹوڈیو میں ڈھاک بیٹھ گئی۔ اسٹوڈیو میں واقعی یہ پہلا آدمی تھا۔ جو عورت سے مل کر خوش نہ ہوتا تھا۔ جو عورت کو دیکھ کر مسکراتا نہ تھا۔ جو عورت کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔ جہاں کہیں لڑکی نظر آئی، وہیں پنڈت جی رفوچکر ہوئے۔ جہاں

لڑکیاں ہنستی، مچلتی، بھاگتی ہوئی نظر آئیں۔ پنڈت جی دُم دبا کر بھاگے۔ اگر کوئی لڑکی پنڈت جی کے قریب آکر اُن سے مذاق کرتی، تو فوراً ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ پیشانی پر شکن آجاتی، اور بھویں تن جاتیں۔ اور اگر اس رویہ سے بھی لڑکی ان کا پیچھا نہ چھوڑتی، تو پنڈت جی خود دھوتی سنبھالتے ہوئے، بڑبڑاتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتے۔ پنڈت جی کو فلمی زندگی پسند نہ تھی، نہ ڈائرکٹروں، ایکٹروں، اور ایکٹرسوں کی زندگیوں پر بری طرح تنقید کرتے تھے انھیں یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی کہ کوئی ڈائرکٹر یا ایکٹر کسی ایکٹرس کو بغل میں لے کر باتیں کرے۔ یا سیٹ پر ہنسی مذاق کرے، یا ریہرسل کے وقت کوئی لڑکی آنکھ مٹکاتی یا کولھے ہلاتی سامنے سے نکل جائے۔ پنڈت جی ان حرکتوں کو دیکھ کر کہتے "بھائی، ایکٹنگ کوئی مذاق نہیں۔ آنکھیں مٹکانا، یا بھوؤں کو اوپر چڑھانا، اداکاری نہیں۔ ڈائرکٹر یا ہیرو کی بغل میں بیٹھ کر ایکٹنگ نہیں آتا۔ رانی صاحبہ، ریاضت کرنی چاہیے۔ مشق کرنی چاہیے، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ڈائلاگ بولنے کی مشق کرنی چاہیے۔ یہ سب باتیں یونہی نہیں آجاتیں۔ سوچ سمجھ کر آتی ہیں۔ ٹھہراؤ سے آتی ہیں۔ مشق سے آتی ہیں، اپنی ایکٹرسیں تو صرف کولھوں کو مٹکانا اور آنکھوں کو نیچے اوپر گھمانا جانتی ہیں، اور ہمارے ایکٹر، گولڈ فلیک کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑ کر، اور ایک بھڑکیلی بش شرٹ پہن کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ چارلس بوآیاں اور رابرٹ ڈوناٹ سے کسی طرح کم نہیں جب تک یہ لوگ اپنا چال چلن درست نہیں کرتے، سچی اداکاری ان کے نزدیک نہیں پھٹک سکتی۔"

اور اسی طرح پنڈت جی اسسٹنٹ ڈائرکٹری کے رعب میں آکر نئے نویلے چھوکروں پر رعب جماتے، اکثر ان کا لیکچر بیکار جاتا، یار دوست ہنستے، اور پنڈت جی کو سنکی سمجھ کر معاف کر دیتے۔ اور کسی ایکٹر تو پنڈت جی کو جھاڑ دیتے، اور کہتے۔ "ارے یار کیا دیہات سدھار کی باتیں کرتے ہو۔ شراب تو پہلے ہی کانگرس نے بند کر دی ہے، اب تم دوسرے مال کو بھی حرام قرار دینا چاہتے ہو۔ نہ خود کھاتے ہو، اور نہ ہی دوسروں کو کھانے دیتے ہو"

پنڈت جی اکثر یہ فقرے سنتے، تو خاموش ہو جاتے، وہ جانتے تھے، کہ اگر یہاں زیادہ بحث کی، تو سارا اسٹوڈیو اکٹھا ہو جائے گا، اور ان کی وہ گت بنے گی، کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

* * * * * *

فلمی دنیا میں پنڈت جی ایسے لوگوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ جس اسٹوڈیو میں اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں بہت کم کمپنیاں شوٹنگ کرتی ہیں۔ یہ لوگ اعلانیہ کہتے ہیں، کہ بھائی۔ ہم لوگ تو کام کرنے آتے ہیں۔ کوئی تعلیم، یا شکشا لینے نہیں آتے۔ دیاکھیان سننے نہیں آتے، اور پنڈت جی کے خشک اور بے جان لیکچر کون سنے، آہستہ آہستہ کمپنی کے لوگ ان سے دور رہنے لگے۔۔ لڑکیاں تو پہلے ہی اُن سے دور بھاگتی تھیں۔ اب ایکٹر بھائی بھی اُن کا مذاق اڑانے لگے، پنڈت جی ایک عرصے سے ایک ہی ڈائرکٹر کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اور اس دوران میں انھوں نے بہت ریاضت کی۔ لیکن چند سال ہی میں انڈسٹری میں رہ کر انھیں اس بات کا احساس

ہوگیا۔ کہ وہ محض ریاضت سے آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ یعنی لڑکی سے عشق نہ کرنے سے۔ یا صرف لوگوں، ڈائریکٹروں، ایکٹروں پر تنقید کرنے سے آدمی بڑا نہیں بن جاتا۔ بڑا بننے کے لئے بہت سی باتوں کا گیان چاہئے۔ یا ایسی باتوں کی سوجھ بوجھ ہو۔ جو اُسے فلمی دنیا میں آگے بڑھا سکیں۔ لوگوں سے مل بیٹھ کر باتیں کرنا، کبھی کبھار جوہو پر جاکر شراب پینا، چمکیلی بش شرٹ پہننا، ہاتھ میں سگرٹ کا ڈبہ پکڑنا، کافی ہاؤس میں کافی پینا۔ ڈائرکٹروں کے گھروں کے چکر لگانا، جسے دراصل مسکا لگانا کہتے ہیں۔ جو لوگ مسکا لگانے میں ماہر ہیں۔ وہی اس انڈسٹری میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔۔۔ اسی طرح کئی سال گذرتے چلے گئے۔ لیکن پنڈت جی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہی رہے۔ شروع میں پنڈت جی کافی صحت مند تھے، جسم پر گوشت تھا، آنکھوں میں چمک تھی۔ اور چال میں توانائی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا، ان کی ریاضت، ان کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی۔ جب کبھی وہ کسی لڑکی کی ہنسی سنتے، تو وہ کڑھنے لگتے۔ جب کوئی لڑکی مسکراتی ہوئی، کولھے مٹکاتی ہوئی، ان کے قریب سے گذر جاتی، تو ہوا میں ایک بجلی سی کوند جاتی، اور اس کا اثر ان کے ذہن پر ضرور ہوتا۔ وہ سوچتے اور سوچتے رہتے۔ لیکن اندھیرا بڑھتا جاتا۔ اور اس اندھیرے میں بجلی چمکتی رہتی، وہ سونے کی کوشش کرتے، لیکن آنکھوں کی نیند گم ہوجاتی۔ اندھیرا بڑھتا، اور لڑکیاں مسکراتیں، قہقہے لگاتیں آنکھیں مٹکاتیں، سر سے پلو سرکاتیں، ہنستی ہنستی بل کھا جاتیں۔ اور پنڈت جی اس اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے، لیکن اس اندھیرے میں اتنی طاقت تھی، اتنی کشش تھی کہ وہ اندھیرے سے بچ کر نہ جا سکتے تھے۔ اس اندھیرے میں ایک

مقناطیسی قوت تھی۔ اس میں زندگی کا بلاوا تھا۔ خواہشوں اور امنگوں کا ایک طوفان تھا، ان کی تیس سالہ زندگی کا دبا ہوا غمبیرا اس اندھیرے میں اُبھر رہا تھا، ان کے قریب آ رہا تھا۔ انھیں اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، اُن پر ہنس رہا تھا، ان سے کھیل رہا تھا۔ کبھی ڈراتا تھا۔ کبھی دھمکاتا تھا۔ کبھی مسکراتا تھا، کبھی پیار کرتا تھا لیکن پنڈت نے اندھیرے سے پیار نہ کیا۔ زندگی کو موت سمجھا۔ اور دن بدن وہ موت کے قریب آتے گئے۔ وہ اس اندھیرے سے بچ کر بھاگنا چاہتے تھے لیکن راستہ کوئی نہ تھا۔ وہ متواتر فاقے کرتے لیکن اندھیرا پھر ان کا تعاقب کرتا، آہستہ آہستہ انھوں نے اپنی خوراک کم کر دی۔ وہ ضدی تھے، اپنی دھن کے پکے تھے۔ موت سے لڑنا چاہتے تھے۔ ہفتے میں ایک دو فاقے ضرور کرتے، مرغن چیزوں سے وہ پہلے ہی دور بھاگتے تھے ـــــــ اب دودھ اور دہی سے پرہیز کرنے لگے ـــــــ خوراک کی کمی کی وجہ سے ان کی صحت کمزور ہوتی گئی۔ گوشت آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑنے لگے، گال پچک گئے ـــــ آنکھوں میں چمک کی جگہ وحشت نے لے لی۔ لیکن دل میں وہی ارادہ تھا، وہی یقین تھا۔ زندگی کے اُصول تھے، نگاہوں میں وہی کھنچاؤ تھا۔ چال میں وہی اکڑ تھی۔ باتیں اُسی طرح روکھی روکھی ـــــ زبان میں چاشنی اور نرمی غائب۔ پنڈت جی کی زندگی اُسی راہ پر گامزن تھی، اتنی کٹھن ریاضت کے باوجود وہ فلمی دنیا میں ترقی نہ کر سکے، اور نہ ہی زندگی میں کوئی ایسا ساتھی ملا۔ جو انھیں ڈھارس دے سکتا۔ یا جو اُن کے بنائے اصولوں پر یقین دلاتا ـــــــ لیکن کچھ عرصے سے دو لڑکیاں پنڈت جی میں کافی دلچسپی لے رہی

تھیں ـــــ یہ دو بہنیں تھیں ۔ جو اکسٹرا میں کام کرتی تھیں ۔ ایک کا نام جانکی تھا، دوسری کا نام شوبھا ۔ ایک بدصورت، دوسری خوبصورت ۔ بدصورت جانکی تھی، اور خوبصورت شوبھا ۔ جانکی کا اثر شوبھا پر ضرور تھا ۔ جانکی اور پنڈت جی کے خیالات ایک دوسرے سے ملتے تھے، جانکی بھی لڑکوں میں بیٹھ کر خوش نہ ہوتی تھی، اگر کوئی لڑکا اُس سے مذاق کرتا، تو وہ اسے ایسی کھری سناتی، کہ وہ دوبارہ اُس سے مذاق کرنے کی جرات نہ کرتا ۔ چونکہ وہ بدصورت تھی، اس لئے ڈائرکٹر لوگ اس لڑکی کو لفٹ نہ دیتے تھے ۔ لیکن پنڈت جی کو جانکی پسند آئی، پہلی بار انھیں ایسی لڑکی ملی تھی ۔ جو ان کے بنائے ہوئے اصولوں کے قریب تھی، جانکی کا کیریکٹر واقعی بلند تھا ۔ پاک اور صاف تھا ۔ اس نے آج تک کسی لڑکے سے مذاق نہ کیا ۔ ہنس کر بات نہ کی، کسی کی طرف پیار بھری نظروں سے نہ دیکھا ۔ اگر تاکا تو صاف تاکا ۔ بغیر کسی جنبش کے، رزش کے، ان آنکھوں میں بے حیائی نہ تھی، محبت نہ تھی، تقدس نہ تھا، بہار نہ تھی، خوشی نہ تھی، رعنائی نہ تھی ۔ آنکھوں میں غصہ تھا، چہرے کے نقش میں سنگلاخی زندگی سے مقابلہ کرنے کی قوت تھی ۔ آگے بڑھنے کی تمنا تھی، کام کرنے کی صلاحیت تھی ۔ ان باتوں کے باوجود یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اس لڑکی نے اپنے من کو مارا ہے، خوشیوں کو اجاڑا ہے ۔ بہار سے نفرت کی ہے، چاندنی راتوں کی سرگوشیاں نہیں سنی، آبشاروں کا گیت، اس کے کانوں تک نہیں پہنچا ۔ محبت اور پریم کی بولیاں، شہد آگیں تنفس، عشق کی بے قراریاں اور محبت کی لاچاریاں ۔ ہجر کی راتیں، اور وصال کی گھڑیاں ۔ یہ سب کچھ اس لڑکی کے

لئے پھرایا تھا۔ وہ ان سب باتوں سے الگ تھلگ رہی۔ اور اس روک تھام کا اثر جانکی کے جسم پر تھا، بہار خزاں میں مبدل ہو چکی تھی، نہ آبشار تھے، نہ گیت اور نہ ہی جھرنے ــــــ موت اپنا وسیع جال لئے، جسم کے مختلف حصوں پر اثر انداز ہو گئی تھی ــــــ شباب مر چکا تھا، چھاتیاں غائب، کولھے غائب، وہی بے جان چھاتیاں، وہی بے جان کولھے، وہی بے جان آنکھیں، وہی بے جان باتیں ــــــ نصیحتوں سے بھری ہوئیں۔

جب یہ تینوں مل کر بیٹھتے، تو تینوں کو عجب سا احساس ہوتا۔ جیسے سبھی ایک ہی خاندان کے افراد ہیں، جیسے سب نے ایک ہی جگہ پرورش پائی ہے گو شوبھا، ان سے مختلف تھی، نہایت ہی چنچل اور شوخ۔ آنکھوں میں بجلی کی سی چمک، اور جسم میں لچک۔ چال میں بے باکی، اور گفتگو، چٹاخ پٹاخ۔ یہ دونوں شوبھا کو اپنے دائرے کے اندر قید کرنا چاہتے تھے، اُسے اپنے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے، قدم قدم پر اُسے نصیحتیں کرتے۔ کبھی کبھی شوبھا اُن کی بات مان جاتی۔ لیکن کبھی کبھی اس کا جی چاہتا، کہ وہ اس دائرے کو چیر کر، دوڑاتی ہوئی باہر چلی جائے۔

ایک دن تینوں اکٹھے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ شوبھا نے اٹھلاتے ہوئے کہا: پنڈت جی "

پنڈت جی نے حیران کن نگاہوں سے شوبھا کو تاکا۔

"اپنا ہاتھ سینے پر رکھئے "

"کیوں" - پنڈت جی نے گھور کر کہا
"رکھئے نا پنڈت جی" شوبھا نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"بات کیا ہے"
"پہلے ہاتھ رکھئے، پھر بات بتاؤں گی"۔ شوبھا نے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔
پنڈت جی کچھ چونک گئے۔ شوبھا کی شوخ نگاہیں دیکھ کر ان کا دل پگھل گیا۔ گو چہرے کے نقش اس کی طرح سخت تھے، لیکن دل موم ہو رہا تھا۔
"لو" پنڈت جی نے غصے میں آ کر کہا
"یوں ہاتھ رکھئے۔ ادھر دیکھئے میرے سینے کی طرف" شوبھا نے ساڑھی کا پلو سینے سے ہٹا دیا، اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھا "دیکھا آپ نے"
"اچھا، اس طرح"
"جی ہاں، بالکل اس طرح" شوبھا نے خوش ہو کر کہا
"لو رکھ لیا"
"اب میں آپ کے ہاتھ کی جلد اپنی طرف کھینچوں گی، لیکن آپ اپنا ہاتھ سینے سے نہ ہٹنے دیجئے گا"
شوبھا نے نہایت زور سے پنڈت جی کے ہاتھ کی جلد کھینچی۔ لیکن پنڈت جی کا ہاتھ سینے پر جما رہا۔ وہ ہاتھ ایک میخ کی طرح سینے میں اٹک گیا تھا۔
"لگاؤ زور"

"نہیں ہٹتا پنڈت جی"۔ شوبھا نے اپنی کمزوری کا اظہار کیا۔

"یہ برہمچاری کا ہاتھ ہے شوبھا، کسی اتیاچاری کا نہیں۔ مجھے دبلا پتلا دیکھ کر اتنا کمزور نہ سمجھ لینا"

"دیکھی ہوئی ہے میں نے آپ کی طاقت"

"لو رکھو، تم اپنے سینے پر ہاتھ"

"لیجئے، رکھ لیا، کھینچئے"۔ شوبھا نے شوخی سے کہا

پنڈت جی نے شوبھا کی طرف دیکھا، پھر اس کے سینے کی طرف، ابھری ہوئی چھاتیوں پر ایک ہاتھ۔ چھاتیوں کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سے گئے۔

"آپ کیوں گھبرا رہے ہیں، شرمایئے نہیں۔ کھینچئے اب"، شوبھا نے چلا کر کہا۔

پنڈت جی کا ہاتھ آگے بڑھا۔

جھٹکا اتنے زور کا لگا، کہ شوبھا کا ہاتھ سینے سے الگ ہو گیا۔ اور وہ ہائے رام کہہ کر الگ ہو گئی۔

"کیا ہوا شوبھا؟"

"آپ تو نرے جانور ہیں"، شوبھا نے چمک کر کہا

"مجھے کیا معلوم تھا، کہ تمھیں اتنا درد ہو گا"

"ذرا آہستہ سے جلد کو کھینچئے۔ دیکھئے ہاتھ سن ہو کر رہ گیا ہے"

پنڈت جی نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ شوبھا کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک پڑے، اُس وقت جانکی اُس کی مدد کو آئی۔ اور کہنے لگی۔

"تمھیں یونہی ادھر ادھر کی باتیں سوجھتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی کھیل ہے"

"میں تو ان سے مذاق کر رہی تھی"

"اور میں نے تمھیں سو بار کہہ دیا ہے، کہ تم مجھ سے مذاق نہ کیا کرو" پنڈت جی نے چڑ کر کہا۔

"بڑوں سے کون مذاق کرتا ہے، مذاق کرنا ہے تو اپنی سہیلیوں سے کرو، مردوں سے ہنسی ٹھٹھول اچھا نہیں ہوتا۔ سچ بات تو یہ ہے، کہ تم چپ چاپ کبھی نہیں بیٹھ سکتیں۔ سٹ پر جاؤ، تو وہاں پر اُودھم مچاتی ہو۔ لڑکوں سے آنکھیں لڑاتی ہو، ڈائرکٹر سے مذاق کرتی ہو، ہیرو کے ساتھ کھانا کھاتی ہو، میوزک ڈائرکٹر کے ساتھ مل کر گانا گاتی ہو، یہ اچھے لچھن نہیں ہیں"۔ جانکی نے بڑی اماں کے انداز میں یہ سب باتیں کہیں۔

"کس لڑکے سے میں نے مذاق کیا، میری اماں"

"مجھے اماں کیوں کہتی ہو" جانکی نے چڑ کر کہا

"اس لئے کہ تم واقعی بڑی اماں کی طرح باتیں کرتی ہو"

"دیکھ لیا پنڈت جی کی آپ نے"——

"کونسا لڑکا تھا جانکی جس سے شوبھا——" اتنا کہہ کر پنڈت جی رک گئے۔

"ہاں بتاؤ، کون سا لڑکا تھا"

"وہی جو تمھارے قریب کھڑا تھا"

"میرے قریب تو بہت سے لڑکے کھڑے تھے"

"وہ جو تمھاری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا، اور تمھارے سینے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا"

"میرے سینے کی طرف دیکھ رہا تھا، تو اس میں میرا کیا دوش" شوبھا نے نہایت معصومانہ انداز سے کہا۔

"کون تھا وہ پاجی"۔ پنڈت جی نے کڑک کر کہا

"کتنے ہی پاجی آتے ہیں پنڈت جی۔ لیکن ہمیں ان پاجیوں سے کیا تعلق۔ ہمیں زندگی میں کام کرنا ہے، آگے بڑھنا ہے، اگر یونہی لڑکوں سے مل بیٹھ کر زندگی گذار دی، تو ہم نے کیا کمایا۔ کتنی بار اسے ٹوک چکی ہوں، لیکن یہ لڑکی مانتی ہی نہیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی ہے، جسم میں آگ سی بھری ہوئی ہے اس کے جسم کا ہر حصہ تھرکتا رہتا ہے"

"اس لئے کہ میں ناچنا جانتی ہوں، اور ایک مشہور ڈانسر ہوں" شوبھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گلی کے اس پار تو تمھیں کوئی پوچھتا نہیں، اور اگر ناچنے کا شوق ہے تو گھر میں ناچو"

"اگر میں صرف گھر میں ناچتی رہوں، تو کھاؤں کہاں سے، ماں کب کی مر چکی، اور باپ نے دوسری شادی کر لی ہے"

"خود کماؤ اور کھاؤ"

"وہی کر رہی ہوں۔ تم کون سا کما کر کھلاتی ہو۔ لیکن مجھے تم یہ بتاؤ تم کیوں ڈانس کرتی ہو۔ تمھیں تو ناچنا بھی نہیں آتا۔ پھر بھی بندروں کی طرح کولھے مٹکاتی رہتی ہو، تمھیں گانا نہیں آتا۔ لیکن کورس میں ضرور گاتی ہو، یہ سب باتیں کیوں کرتی ہو"

"اگر میں یہ باتیں کرتی ہوں، لیکن عزت اور آبرو کو کھو کر نہیں، کیوں پنڈت جی"

"کیا مطلب تمھارا؟" شوبھا نے غصے میں آکر کہا۔ وہ یہ فقرہ سن کر جل بھن گئی۔

"مجھے تمھارا چلن اچھا نہیں لگتا" جانکی نے چیختے ہوئے کہا۔

"تم تو جلتی ہو مجھ سے، کوئی لڑکا مجھ سے بات کرے، تو تمھیں آگ سی لگ جاتی ہے۔ ڈائریکٹر مجھ سے بات کرے، تو تمھیں رات بھر نیند نہیں آتی، میں کسی سے ہنس لوں، تو تمھارا خون کھول اٹھتا ہے۔ معلوم نہیں تم کس قسم کی لڑکی ہو، اور تم کیا چاہتی ہو"

"وہ تمھاری بھلائی کے لئے سب کچھ کہتی ہے، شوبھا"۔ پنڈت جی نے پیار سے کہا۔

"بھلائی اور اچھائی۔ میں کہتی ہوں کیسی بھلائی۔ کس کی اچھائی" شوبھا کو اور غصہ آگیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھی، اور کمرے میں چکر کاٹنے لگی، جانکی میری بات سن لو، اور غور سے سن لو۔ مجھے تمھاری باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں

میں لڑکوں سے مل کر خوش ہوتی ہوں، سمجھیں۔ مجھے ہنسنا، کھیلنا اچھا لگتا ہے۔ میں جب ناچتی ہوں، اور خوب جی بھر کر ناچتی ہوں، تو جسم کی ہر نس تھکن سے چور ہو جاتی ہے، اور رات کو مجھے نہایت ہی میٹھی اور بھلی نیند آتی ہے۔ صبح مجھے خوب بھوک لگتی ہے۔ میں جی بھر کر کھانا کھاتی ہوں۔ دن بدن میرا خون بڑھتا جا رہا ہے میں صحت مند ہوتی جا رہی ہوں پنڈت جی، پہلے میں بہت دبلی پتلی تھی، بالکل جانکی کی طرح مریل، نرا کچرا۔ لیکن اب تو میرا جسم بھر گیا ہے۔ اب تو پرانے بلاؤز فٹ نہیں آتے، کل میں نے اپنے پرانے بلاؤز ٹھیک کرنے کے لیے درزی کو دیئے ہیں۔ پنڈت جی کیا میں پہلے سے صحت مند ہو گئی ہوں۔ دیکھئے نا اس بازو کی مچھلی دیکھئے اب یہ کتنی سخت ہو گئی ہے"

"لگائیے ہاتھ اسے"

"ہاں بابا، بہت سخت ہو گئی ہے۔ اب گاما پہلوان سے لڑو جا کر"

"اور میں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہوں"

"خوبصورت"

"یعنی صحت مند، پنڈت جی"

"اور جانکی"

"وہ تو نرا کچرا ہے"

"اور میں"

"آپ بھی دبلے پتلے ہو رہے ہیں۔ اور اگر آپ کے دبلے پن کی یہی رفتار رہی، تو ایک دن سوکھ کر کمان بن جائیں گے۔ اور کمان کہتے کہتے شنو بھا

ہنسنے لگی۔ اور ہنستے ہنستے ناچنے لگی۔ اور ناچتے ناچتے گانے لگی "نین سے نین ملے، آنکھوں کو چین ملے"، کمرے میں ایک دو چکر کئے۔ کولھوں کو مٹکایا۔ ایک انگڑائی لی۔ اور تھرکتی ناچتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

کچھ عرصے کے لئے تو پنڈت جی عالم سکتہ میں رہے، شوبھا نے جب انگڑائی لی تھی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اندھیرے کمرے میں کسی نرم و نازک کرن نے جھانک کر دیکھا ہو۔ اور جب شوبھا نے یہ گیت گنگنایا تھا، کہ "جب نین سے نین ملے، اور آنکھوں کو چین ملے"، تو انھیں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی ویرانے سے نکل کر گلستان میں آ گئے ہیں۔ جیسے سبزہ زاروں پر ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم چلے، اُن کا دل واقعی صحرا تھا۔ واقعی کھنڈر تھا۔ اُس میں تیز و تند لُو چلتی تھی، خون میں بے پناہ تپش تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تو کبھی کبھی میسر ہوتے تھے۔ جب کبھی بہار کا جھونکا آیا، تو خزاں نے آتے ہی اس کا گلہ دبوچ لیا۔ زندگی کی کونپل پھوٹی۔ کہ جڑوں میں ناسور ہو گیا۔ زمین پتھریلی ہو گئی وہ نرم و نازک کونپل مرجھا کر گر پڑی۔۔۔

"کیا سوچ رہے ہو پنڈت جی"۔ جانکی نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"لڑکی نہیں، طوفان ہے، جانکی"

"بدتمیز، ایسی منہ کی کھائے گی، کہ ساری عمر یاد کرے گی۔ میں نے شاید آپ کو نہیں بتایا، آجکل وہ ایک ہیرو کے ساتھ سینما دیکھنے جاتی ہے، اُس سے کھلم کھلا باتیں کرتی ہے۔ اُس سے ہنستی ہے، کھیلتی ہے،

آنکھیں مٹکاتی ہے، بے حیا کہیں کی ‘‘

’’ واقعی یہ بہت بڑی بات ہے ‘‘

’’ اب مجھے رتی بھر اچھی نہیں لگتی ‘‘

’’ ہمیں اُسے سدھارنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے ‘‘، پنڈت نے جانکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’ آپ نے دودھ پیا، پنڈت جی ‘‘

’’ نہیں تو ‘‘

جانکی، چارپائی سے اٹھی۔ انگیٹھی جلائی، دودھ گرم کیا، اور پنڈت کو دودھ پلایا۔ پنڈت جی نے دودھ پیا، اجازت مانگی اور چلتے بنے۔

× × × × × ×

اور اس طرح پنڈت جی۔ ان دو لڑکیوں سے اچھی طرح گھل مل گئے انھوں نے اسسٹنٹ ڈائرکٹری چھوڑ دی۔ اور ان کی زندگی کا مرکز محض یہ دو لڑکیاں بن کر رہ گئیں۔ وہ ان لڑکیوں کے گھر آتے، اور کئی گھنٹے بیٹھے رہتے۔ کبھی وہ فلم کمپنی جاری کرنے کے خواب دیکھتے۔ کبھی وہ رسالہ نکالنے کی اسکیم بناتے۔ رسالہ کا نام انھوں نے ’سورگ‘ رکھا تھا، اسسٹنٹ ڈائرکٹری چھوڑ کر ان کی مالی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اب ان کا تمام وقت ان لڑکیوں کے ساتھ گذرتا۔ شوبھا اکثر انھیں کام کاج کے لئے کہتی۔ تو وہ انکار نہ کرتے بلکہ بڑے فخر سے وہ شوبھا کا کام کرتے۔ وہ بازار سے تمباکو، پان، بسکٹ، کریم، صابن، لپ اسٹک خرید کر لاتے، اور جب کبھی شوبھا کی شوٹنگ

ہوتی، تو اس کا بیگ اٹھا کر لے جاتے اگر بیگ نہ اٹھانا پڑتا، تو وہ دونوں کو اسٹوڈیو میں چھوڑ آتے، اور جب شوٹنگ ختم ہوتی، تو وہ دونوں کو گھر لے آتے۔ شوبھا چونکہ خوبصورت اور چنچل تھی، اس لئے ڈائرکٹروں کی نظروں میں بچ گئی تھی۔ اور ڈائرکٹر شوبھا کو ہر طرح سے یقین دلاتے تھے، کہ وہ ایک دن اسکرین پر ہیروئن بن کر آئے گی۔ اور فلمی دنیا میں آفتاب بن کر چمکے گی۔ پنڈت جی ان باتوں کو سنتے، اور کبھی کبھی وہ خیال کرتے، کہ اگر شوبھا ہیروئن بن گئی، تو شاید وہ ان کی پرواہ نہ کرے۔ وہ شوبھا کو اپنے دائرے میں مقید کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر شوبھا کو ایک آدرش ہیروئن بننے کے لئے تلقین کرتے اور کہتے "شوبھا۔ زندگی میں ترقی کرنے کے لئے تن اور من کو مارنا چاہیئے۔ گوشت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ شراب اور ریس کے نزدیک نہ پھٹکنا چاہیئے۔ اور گناہ کا خیال دل میں کبھی نہ لانا چاہیئے"۔

جانکی اور شوبھا، دونوں پنڈت جی کی باتیں غور سے سنتی۔ لیکن شوبھا یہ باتیں سن کر بھی اپنے ہی راستے پر گامزن تھی۔

خدا بچائے اس طوفان سے ـــــ وہ پہاڑی نالے کی طرح بل کھاتی ہوئی۔ گنگناتی۔ اور آن واحد میں پنڈت جی کے فاقوں اور ریاضتوں پر پانی پھیر دیتی۔ ایک دن وہ ہنستی کھیلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ جانکی اور پنڈت جی بھی موجود تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی جانکی سے لپٹ گئی۔ اور کہنے لگی۔ پنڈت جی، پنڈت، میں آپ کے لئے خوشخبری لائی ہوں۔

"کون سی خوش خبری"

"میں اسٹنٹ پکچر میں، ہیروئن بن گئی ہوں"

"سچ کہتی ہو"۔ جانکی نے اچھل کر کہا

"تمھاری قسم"

"تو پھر کچھ کھلاؤ"

"کیا کھاؤ گے"

"لڈو۔ پیڑے، امرتی"

"لو کھاؤ۔ لڈو"۔ شوبھا نے ایک چھوٹا سا بنڈل کھولا۔ اور دونوں کے سامنے لڈو رکھ دیئے۔ مری ہوئی زندگی میں کچھ زندگی عود آئی۔

لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے شوبھا نے کہا "دیکھو۔ مجھے ابھی ایک ڈائرکٹر سے ملنے جانا ہے۔ اور ڈائرکٹر سے ملنے کے لئے مجھے ایک حسین بلاؤز پہننا چاہیئے۔ کیوں میری اماں"

"خوبصورت بلاوز پہننے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمھارا کام ڈائرکٹر کو پسند ہے، تو ہر بات ٹھیک ہے"

"خوبصورت جسم پر خوبصورت بلاوز خوب سجتا ہے، میری بہن"۔ شوبھا نے جانکی کو چڑاتے ہوئے کہا۔

"لیکن دکھانے سے کیا فائدہ"

"دکھانے کے لئے کون پہنتا ہے، میرا جی چاہ رہا ہے، کہ میں ایک خوبصورت بلاوز پہنوں۔ اس لئے میں ایک خوبصورت بلاؤز پہن کر رہوں گی"

"اگر ہم نہ پہننے دیں تو"، پنڈت جی نے چمک کر کہا۔

"آنکھیں بند کرو پنڈت جی"، شوبھا نے آنکھیں دکھلاتے ہوئے کہا
پنڈت جی نے بغیر کسی حیل و حجت کے آنکھیں بند کر لیں۔
شوبھا نے ٹرنک سے ایک بلاؤز نکالا۔
"آنکھیں بند رکھئے پنڈت جی"
شوبھا نے اپنا بلاؤز اتار دیا۔
"آنکھیں بند رکھئے پنڈت جی، کن انکھیوں سے مت دیکھئے گا، میرے جسم کی طرف"
"یہ باڈی بھی تو کتنی تنگ سی ہو گئی ہے، اور بلاؤز تو فٹ آتا ہی نہیں"
شوبھا نے جانگی کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔
"سو بار کہہ چکا ہوں، کہ شریف اور نیک گھرانے کی لڑکیاں تنگ بلاؤز نہیں پہنتیں"، پنڈت جی نے آنکھیں بند کئے ہوئے جواب دیا۔
شوبھا نے بلاؤز پہن لیا۔ کولھوں پر سے ساڑھی درست کی، اور ساڑھی کے پلو کو سینے کے ایک طرف لا کر ٹھیک کر دیا۔
"اب آنکھیں کھول لو پنڈت جی۔ یہ بتایئے، یہ بلاؤز کیسا لگتا ہے"
"بالکل بازاری"، پنڈت جی نے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"خاموش رہئے" اس نے پھر اپنے بلاؤز کی طرف دیکھا۔ اور پیشانی پر زلف کو ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگی: "میں جا رہی ہوں"
"کب واپس آؤ گی"

"جب ڈائرکٹر چھٹی دے گا"

"آج میک اپ تو نہیں"

"نہیں"

"تو پھر زیادہ عرصہ ٹھہرنے سے کیا فائدہ"

"باتیں کروں گی"

"کیا باتیں کرو گی"

"ہنسی خوشی کی۔ ذرا ہنسوں گی، تھوڑا سا ناچوں گی، ڈائرکٹر سے مذاق کروں گی۔ اور ہیرو کو چھیڑوں گی، اور پھر گھر آجاؤں گی"

"باز آجاؤ ان باتوں سے شوبھا"۔ جانکی نے تنگ کر کہا۔

"یہ اچھی باتیں نہیں" پنڈت جی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اور شوبھا نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور گاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

شوبھا کمرے سے نکل گئی، لیکن پنڈت جی کے دل سے نہ نکلی۔ جانکی نے یہ سب کچھ دیکھا، لیکن پتھر کی طرح خاموش رہی۔ دونوں کی سخت کوششوں کے باوجود شوبھا اپنے ہی راستے پر گامزن تھی، پنڈت جی تو جل بھن کر کباب ہو جاتے، ان کے دل میں رہ رہ کر اس لڑکی کا خیال آتا۔ وہ اسے سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، لیکن شوبھا میں وہی شوخی تھی، وہی شرارت تھی اس کا مذاق وہی، اس کا ہنسنا، چہکنا، پھرنا، دوڑنا، اکڑنا۔ ان سب چیزوں

میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ اور جانکی بھی ہاتھ دھو کر شوبھا کو درست کرنے پر تلی ہوئی تھی، وہ ہر طرح پنڈت کی مدد کرتی۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتی۔ اسٹوڈیو کی باتیں پنڈت جی کو بتلاتی۔ معلوم نہیں جانکی کیوں اس قسم کی حرکتیں کرتی تھی، شاید ابھی تک جانکی کی زندگی میں ایسا کوئی مرد نہ آیا تھا، جو اُسے اپنی باہوں میں بھینچ کر کہتا "جانکی۔ تم میری ہو۔ تم میری ہو۔ تم واقعی غلط راستے پر جا رہی ہو، تم اپنے من کو مار کر روح کو جھوٹی تسلیاں دے رہی ہو۔ تم غلط راستے پر جا رہی ہو۔ ابھی بھی وقت ہے۔ واپس لوٹ آؤ۔ واپس لوٹ آؤ" لیکن وقت گذرتا گیا۔ اور عمر بڑھتی گئی۔ جوانی گذرتی گئی۔ اور خون میں حدت کم ہوتی گئی۔ اگر اب خون میں خواہش باقی تھی، تو مری ہوئی۔ جیسے صدیوں کا بوجھ ان پر پڑ گیا ہو، جیسے پتھر کی سل رکھ دی گئی ہو۔ اور اس کے نیچے جانکی کی آرزوئیں، خواہشیں، تمنائیں، اس کی بہاریں، کچل کر رکھ دی ہوں۔ اور اب جانکی کے پاس کیا تھا صرف نفرت، مردوں کے لئے نفرت، اُن سے دور رہنے کی خواہش۔ اور جب اس دوران میں جانکی کی ملاقات پنڈت جی سے ہوئی۔ تو اس کے خیالات کو اور تقویت ملی۔ پنڈت جی بھی اسی دور سے گذر رہے تھے۔ پنڈت بدصورت تھے، اس لئے وہ عورتوں سے دور بھاگتے رہے۔ انھوں نے زندگی میں کامیابی حاصل کرنی چاہی، لیکن ناکامیاب رہے۔ مالی حالت اچھی نہ رہی صاف ظاہر ہے کہ عورت اُن کے نزدیک نہ آئی۔ نہ عزت ملی، نہ دولت نصیب ہوئی اور نہ عورت نے قریب پھٹکنے دیا۔ اب جب شوبھا سے ملاقات ہوئی، تو سوئی ہوئی چنگاری جاگ اُٹھی، پاؤں ڈگمگا گئے۔ شکست خوردہ سپاہی کی طرح

وہ آگے پیچھے بھاگنے لگے، جو ہاتھ میں آئے وہی سہی۔ وہ عورت سے نفرت کرتے ہوئے محبت کرنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی سے نفرت کرتے ہوئے، اس کی ساری خوشی نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ اسی تگ و دو، اسی دوڑ دھوپ میں ان کے قدم ڈگمگا گئے۔ وہ اپنا نصب العین بھول گئے۔ اگر اسے نصب العین کہا جا سکتا ہے۔ شوبھا کی محبت ان کے دل میں سرایت کر گئی۔ ان کی روح میں تحلیل ہو گئی۔ ان کے خون کے ذرے ذرے میں شوبھا کی تصویر ابھرنے لگی۔ وہ شوبھا کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ یہ چاہتے تھے، کہ شوبھا خود بخود اُن کے بازوؤں میں آ جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ رسوائی ہونے لگی، گھر دل میں چرچے ہونے لگے۔ گلی محلے والوں نے شوبھا سے کہا کہ پنڈت جی تم سے عشق کرتے ہیں، شوبھا یہ باتیں سنتی، لیکن ہنس کر ٹال دیتی —— یار دوستوں نے پنڈت کو شوبھا کے گھر جانے سے روکا۔ لیکن ان کے قدم اُس گلی کی طرف اُٹھ جاتے۔ اُن کا دل بار بار یہ کہتا تھا۔ کہ شوبھا اُنھیں کبھی نہیں مل سکتی۔ یہ باتیں بے سود ہیں، بے کار ہیں۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے، ان کا فیصلہ اٹل تھا، ان کا عزم آخری تھا۔ وہ ہر چیز سے مقابلہ کریں گے۔ شاید موت سے بھی۔ وہ شوبھا کو حاصل کر کے ہی رہیں گے ——

"کیا سوچ رہے ہیں آپ"، جانکی نے پوچھا

"یہی کہ ابھی تک شوبھا نہیں آئی"

"کسی سے آنکھ لڑا رہی ہو گی۔ بڑی نٹ کھٹ ہو گئی ہے" جانکی نے غصے میں آ کر کہا۔

اتنے میں شوبھا تیزی سے اندر داخل ہوئی۔

"پنڈت جی، پنڈت جی"

"کیا ہوا شوبھا"

"پنڈت جی آج کمپنی کے ہیرو نے مجھ سے ہاتھ ملایا" شوبھا کے چہرے پر واقعی خوشی کے آثار تھے۔

"وہ کیوں"

"اس نے کہا۔ شوبھا، ذرا اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اور اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا"

"کون تھا وہ ہیرو"۔ جانکی نے چیخ کر کہا

"کمپنی کا نیا ہیرو"

"بے شرم کہیں کا"

"اور اس نے مجھے ایک پھول دیا۔ اور میں نے بالوں میں لگا لیا"

"ادھر لاؤ یہ پھول"۔ پنڈت جی نے غصے میں آ کر کہا

شوبھا نے پھول اتار کر پنڈت جی کو دے دیا۔ پنڈت جی نے پھول کو پاؤں تلے مسل ڈالا۔

اور کہنے لگے "میں ابھی جا کر اس کمبخت سے پوچھتا ہوں، کہ تم نے شوبھا کو کیوں پھول دیا۔ اور اس سے ہاتھ کیوں ملایا"

"پنڈت جی، اس نے آنکھ بھی ماری" شوبھا نے شوخ انداز سے کہا

"حرامزادہ کہیں کا"۔ پنڈت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ چہرے کے

نقش اور سخت ہو گئے۔ ناک کے نتھنے پھول گئے، اور ہونٹ غصے سے تھرتھرانے لگے "میں اس کی چمڑی اُدھیڑ دوں گا، اُسے کیا حق ہے کہ وہ اس قسم کی بے ہودہ حرکت کرے"

"پہلے شوبھا کو سمجھاؤ، پھر غیروں کو گالی دینا" جانکی نے شوبھا کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"مجھے تو ان میں کوئی بری بات نہیں لگی"۔ شوبھا نے آنکھیں کو مٹکا کر کہا۔

"شوبھا، سوچ سمجھ کر بات کرو"

"کیا تم گوشت کھاتی ہو؟" پنڈت جی نے سوالیہ انداز میں بات کی۔

"جی ہاں"

"وہ مت کھاؤ"

"وہ کیوں"

"پہلے یہ بتاؤ۔ کیا تم انڈے بھی کھاتی ہو"

"جی ہاں"

"انڈے مت کھاؤ"

"وہ کیوں"

"بتاتا ہوں ــ دیکھو شوبھا۔ اُتم پھل کھاؤ، تاکہ تمھاری روح بھی اُتم ہو جائے۔ گوشت اور انڈے کھانے سے جسم میں گرمی بڑھتی ہے اور گرمی بڑھنے سے جسم جلتا ہے۔ جسم جلانے سے کوئی فائدہ نہیں"۔

"گوشت باقی سبزیوں سے زیادہ ذائقہ دار ہوتا ہے پنڈت جی"

"زبان کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ تم کچھ لکھا پڑھا کرو۔ ہم ایک رسالہ "سورگ" نکال رہے ہیں۔ اس کے لئے کوئی کہانی لکھو، کوئی ڈرامہ لکھو، کوئی اُتم مضمون لکھو"

"مجھے لکھنا نہیں آتا۔ اور اب میں ہیروئن بن گئی ہوں"

"ہیروئن بن کر کیا کرو گی"

"روپے کماؤں گی"

"کب تک، یہ جوانی کب تک رہے گی۔ یہی دو تین سال۔ اور اس کے بعد بوڑھی ہو جاؤ گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کچھ سالوں کے بعد تم ہیروئن نہ بن سکو گی۔ پھر کیا کرو گی"۔

"جب تک جوانی ہے، تب تک ہنس کھیل لوں"

"اس کے بعد کیا کرو گی"

"جو تم کہو گے"

"پہلے ہی سوچ لو، تاکہ پھر منہ کی نہ کھانی پڑے"

"اس وقت سوچنا بے سود ہے۔ سوچ بچار کے لئے میں نے تم دونوں کو رکھا ہوا ہے۔ اور آج میں ریس دیکھنے جا رہی ہوں"

"کس کے ساتھ"

"ہیرو کے ساتھ"

"ریس میں جانا ٹھیک نہیں"

"کیوں"

"وہاں لوگ جوا کھیلتے ہیں"

"میں بھی جوا کھیلوں گی"

"بری بات ہے"

"کوئی بات نہیں، میں گھوڑے پر روپے لگاؤں گی۔ پانچ کے دس بناؤں گی۔ دس کے سو بناؤں گی، اور سو کے ایک ہزار بناؤں گی۔ اور ایک ہزار کے دس ہزار۔ اور دس ہزار کے ایک لاکھ۔ میرا ہے بھی کون۔ ماں مر گئی ہے، اور باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اور میں ان روپوں سے ایک کار خریدوں گی۔ بیوک پنڈت جی، بیوک۔ کار چلانا خود سیکھوں گی۔ میں خود آگے بیٹھوں گی۔ اور تم دونوں کو پیچھے بٹھاؤں گی۔ اور پھر سیر کروں گی۔ جہو، میرین لائن کی، چرچ گیٹ کی، انڈیا گیٹ کی، اور پھر ایک عالیشان کوٹھی میں میری کار شان سے داخل ہو گی، ادھر ادھر نوکر چاکر ہوں گے۔ اچھے اچھے کھانے کھاؤں گی۔ گوشت۔ انڈے، مرغی۔ پلاؤ۔ اور مزے دار پھل۔ پنڈت جی۔ آم۔ انگور۔ سردہ۔ اور پھر مخمل اور ریشم کے کپڑے پہنوں گی۔ سلک اور جارجٹ کی ساڑھیاں۔ اور کسی شاندار ریسٹورنٹ میں جا کر کہوں گی: بیرہ ایک گلاس وِسکی"۔

"شوبھا" پنڈت جی نے چیخ کر کہا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اور پھر دھیمی زبان میں کہنے لگے۔ "ریس میں نہ جاؤ نہ جاؤ"

"میں ضرور جاؤں گی"

"میں تمھارے پاؤں پڑتا ہوں"

"پاؤں پڑنے سے کیا فائدہ"

"میری لاج رکھو"

"میں جو کہہ رہی ہوں وہی کروں گی"

"یہ بہت بری باتیں ہیں شوبھا۔ تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے"

"میں یہ بری باتیں کر کے رہوں گی۔ تم مجھے نہیں روک سکتے"

"اگر آج تم گئیں، تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میں بھوکا رہوں گا"

"مر جاؤ۔ مجھے کیا"

"شوبھا۔ اگر تم اُس ہیرو کے ساتھ ریس میں گئیں، تو میں رو دونگا"

"روؤ۔ اور جی بھر کر روؤ۔ آخر تم دونوں کیا چاہتے ہو۔ ہر بات پر کیوں ٹوکتے ہو۔ مجھے آگے کیوں نہیں بڑھنے دیتے، تم کون ہو۔ میں جو چاہتی ہوں، وہ مجھے کرنے کیوں نہیں دیتے۔ میں کوئی بچی نہیں، انجان نہیں، تم ہر قدم پر ایک روڑا اٹکا دیتے ہو۔ مجھے تمھاری باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں، میں تمھاری طرح مرنا نہیں چاہتی۔ میں تمھاری طرح سڑنا گلنا نہیں چاہتی، کیا کبھی تم دونوں نے شیشے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ کتنی مکروہ اور گھناؤنی ہو گئی ہیں تمھاری صورتیں۔ نہ خود ہنستے ہو، نہ ہنسنے دیتے ہو۔ نہ خود بات کرتے ہو، نہ باتیں کرنے دیتے ہو۔ نہ خود کھاتے ہو اور نہ مجھے کھانے دیتے ہو، میں سو بار کہہ چکی ہوں کہ اگر کوئی میرے جسم کو ہاتھ لگاتا ہے تو تمھیں کیوں سانپ سونگھ جاتا ہے، تمھیں کیوں آگ لگ جاتی ہے۔ اور آج۔ آج میں ضرور جاؤں گی، دنیا

کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی"
یہ کہہ کر شوبھا کمرے سے نکل گئی۔

*

اُس دن کے بعد شوبھا واپس نہ آئی۔ وہ اُسی ہیرو کے ساتھ رہنے لگی۔ اب شوبھا زیادہ خوش تھی۔ زیادہ حسین ہوگئی تھی۔ زندگی میں آرام زیادہ تھا چین زیادہ تھا، گھٹن کم تھی۔ اب فضا خوشگوار۔ خوش رنگ اور دلفریب ہوگئی تھی، لیکن پنڈت جی کی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ وہ اس سے قبل ہی کافی کمزور اور ناتواں تھے، برت اور فاقے رکھ رکھ کر ان کا جسم دبلا پتلا ہوگیا تھا۔ متواتر بھوک اور بے کاری نے انھیں کافی لاغر بنا دیا تھا۔ شوبھا نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا۔ پہلے صرف دبلے پتلے ہی تھے۔ اب بخار بھی آنے لگا۔ کھانسی بھی شروع ہوگئی، اور سینے میں درد ہونے لگا۔ جانکی تیمارداری کرتی۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا۔ کہ اگر پنڈت جی پہاڑ پر نہ گئے، تو اس سال ضرور داغ مفارقت دے جائیں گے۔ لیکن پہاڑ جانے کے لئے روپوں کی ضرورت تھی۔ روپے کہاں سے آتے۔ دن بھر پنڈت جی کمرے میں پڑے رہتے۔ جانکی صبح اور شام آکر ــــ دوائی پلا جاتی۔ دن بھر ان گنت خیالوں کا ہجوم پنڈت جی کو پریشان کرتا۔ تین برس کی شکستیں، کیلوں کی طرح دماغ میں چبھتیں۔ شوبھا کی فراری نے انھیں ہمیشہ کے لئے اپاہج بنا دیا۔ زندگی میں آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن بڑھ نہ سکے۔ زمانے کا ساتھ نہ دے سکے۔ روپے حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن نہ ملے۔ جب عورت کو حاصل کرنا چاہا۔ تو وہ دوسرے

کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی زندگی ایک کھنڈر بن کر رہ گئی تھی۔ اور اس بھیانک کھنڈر میں، ان کی شکستیں، ان کی ناکام آرزوئیں چمگادڑوں کی طرح سر پھوڑتی تھیں۔

ایک رات جب ان کی حالت خراب ہونے لگی، تو انھوں نے جانکی سے کہا "کیا شوبھا ایک بار بھی مجھے دیکھنے نہ آئے گی"،

"بلا لاؤں اُسے"

"کیا وہ آئے گی"

"کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے"،

اور جانکی ٹیکسی لے کر شوبھا کو لینے چلی گئی۔

اندر رات اندھیری اور سیاہ تھی، اور پنڈت جی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک اسٹول تھا، جس پر ایک بتی رکھی ہوئی تھی۔ ایک چینی کا برتن تھا جس میں پنڈت جی تھوکتے تھے۔ اور ایک کونے میں ایک چھوٹا سوٹ بکس تھا، جس میں پنڈت جی کے پھٹے پرانے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔

بجلی کی جگہ موم بتی جل رہی تھی، تیس برس کی زندگی کا یہی کچھ اثاثہ تھا۔

تھوڑے عرصے کے بعد ایک ٹیکسی کے رکنے کی آواز آئی۔

پنڈت جی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور ساتھ ہی کھانسی کا شدید دورہ شروع ہو گیا۔

شوبھا، ایک نہایت ہی خوشنما ساڑھی میں ملبوس ہو کر داخل ہوئی۔

پنڈت جی کھانس رہے تھے، وہ ان کے سرھانے کھڑی ہو گئی۔

"پنڈت جی شوبھا آگئی"، جانکی نے آہستہ سے کہا

اور وہ کھانستے رہے۔

"میں ہوں پنڈت جی"۔ شوبھا نے پیار سے کہا۔

پنڈت جی کھانستے رہے"

شوبھا، کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی ہوا گندی اور بدبو دار تھی، کمرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ بستر میلا اور کچیلا تھا۔ اب پنڈت جی کی کھانسی رُکی، سانس کی روانی درست ہو گئی۔ کہنے لگے "شوبھا تم نے اچھا کیا، جو آج یہاں آگئیں میں میں —— تم سے ملنا چاہتا تھا —— میں بیمار ہوں —— تپ دق کا مریض ہوں۔ شاید کچھ عرصہ اور زندہ رہوں، ہو سکتا ہے، کل ہی مر جاؤں —— لیکن اب زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ دراصل زندہ رہنا چاہوں، جب بھی میں زندہ نہیں رہ سکتا، جیب میں پیسہ نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، پہاڑ پر جاؤ —— خیر میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ جس راستے کو میں نے اختیار کیا تھا۔ وہ غلط تھا، میں زندگی کا ساتھ نہ دے سکا۔ جن اصولوں کو میں نے اپنایا تھا۔ وہ سودمند ثابت نہ ہوئے۔

اور پنڈت جی پھر کھانسنے لگے۔

جانکی نے ایک سیاہ شیشی سے دوائی کا ایک گھونٹ پنڈت جی کو پلایا۔ تھوڑے عرصے کے بعد کھانسی رک گئی۔

"دراصل میں ضرورت سے زیادہ سیدھا ہوں شوبھا۔ نہ چالاکی آتی

ہے، اور نہ ہی کسی سے ۔ ۲۰ہم کر سکا ۔ صاف ظاہر ہے کہ کامیاب انسان نہ بن سکا —— زندگی کے جو اصول بنائے، چاہے وہ ٹھیک تھے، یا غلط لیکن تجربے کے بعد نکلے غلط ۔ برت اور فاقے کئے، لیکن روح بری طرح گندی رہی ۔ تم سے دور رہنے کی کوشش کی، لیکن کوشش کرنے کے باوجود تمھاری طرف کھنچتا گیا ۔ دماغ میں وہی لالچ تھا، وہی کامنا تھی، وہی ہوس تھی ۔ اور پھر تمھیں چاہا۔" یہاں آ کر الفاظ گلے میں رک گئے ۔ "وہ بھی میری غلطی تھی —— مجھے آج محسوس ہو رہا ہے کہ میں شروع ہی سے ایک غلط راستے پر چل رہا تھا خیر کوئی بات نہیں —— یہ بتاؤ ۔ کیا تم گوشت کھاتی ہو۔"

"کبھی کبھی پنڈت جی،،

"ریس میں جاتی ہو۔"

"جی ہاں"

"شراب پیتی ہو،،

"صرف ایک دو بار پی ہے"

اس کے بعد پھر کھانسی شروع ہو گئی

رات اندھیری اور سیاہ ہوتی گئی —— موم بتی جل جل کر چھوٹی ہوتی جا رہی تھی ۔ پنڈت جی شوبھا کی طرف تکتے گئے ۔

شوبھا کھڑی رہی ۔ اور کچھ نہ کہہ سکی ۔ پھر آہستہ سے منہ موڑ کر آہستہ سے ۔ نہایت آہستہ سے چلی گئی وہاں سے ۔

رات اندھیری اور سیاہ تھی ۔ پنڈت جی کھانستے رہے اور شوبھا

چلی گئی۔ موت اور زندگی کے درمیان ملاپ نہ ہوا ——— صرف کالی رات ہچکیاں لے رہی تھی۔ اور پنڈت جی کے کھانسنے کی آواز فضا میں دم توڑ رہی تھی۔ دور ایک کتا رو رہا تھا۔ اس کی آواز کتنی بھیانک اور ڈراؤنی تھی ——— جانکی کبھی موم بتی کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی پنڈت جی کی طرف ——— دونوں ایک ہی راستے پر گامزن تھے ———

سالی کمینی کہیں کی

شہر میں یہ خبر آن واحد میں پھیل گئی، کہ مایا کو ایک مسلمان لونڈا بھگا لے گیا۔ ادر مسجد میں جا کر مسلمان لونڈے نے مایا سے زبردستی شادی کر لی، اس خبر کے پھیلتے ہی چھوٹے سے شہر میں کھلبلی مچ گئی، ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جہاں بھی چند ہندو جمع ہوتے، مایا کا چرچا ہونے لگتا۔

"ارے ہندوؤں کی ریاست میں اس قسم کا قہر۔۔ ادر پھر دن دھاڑے ایک ہندو لڑکی کا اغوا"

، ہندو بھی ہجڑے ہو گئے ہیں،

جیسا راجہ، ویسی پرجا۔

مسلمانوں کے اتنے حوصلے، کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو بھگا کرلے جائیں کیا ساری ریاست میں کوئی ہندو نوجوان نہ تھا، جو اس لڑکی سے شادی کرسکتا اور اس طرح جتنے منہ اتنی باتیں، آریہ سماجی حلقوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ سناتن دھرم کے پجاری پہلے ہی نیم مردہ تھے۔ آریہ سماجیوں نے آکر ہندوؤں کی گری ہوئی حالت کو سنبھالا تھا۔ سوامی دیانند سرسوتی کے گیت گاگا کر ہندو نوجوانوں کی مردہ روحوں میں پھر سے زندگی پھونکی تھی، دو چار بھیلوں کو شدھ کیا تھا، شہریوں کو اکٹھا کرکے حلوا بانٹا تھا۔ اس دن سے شہریوں کی نگاہ میں سماجیوں کی عزت بڑھ گئی تھی، اور اب ریاست کے ہندو سنبھلنے لگے تھے، کہ واقعی یہ ریاست ہندوؤں کی ہے، اور مسلمان صرف غلام بن کر ہی رہ سکتے ہیں، لیکن اس چیز نے انھیں پھر چونکا دیا۔ جوں ہی آریہ سماج کے سکرٹری کو یہ خبر ملی، تو اس نے اسی وقت شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا۔ کہ شام کے چھ بجے آریہ سماج مندر میں شہریوں کا ایک بڑا بھاری جلسہ ہوگا۔ ہندو دیویوں اور سجنوں کو اطلاع دی جاتی ہے، کہ وہ وقت مقررہ پر آکر قوم کی ڈوبتی ہوئی نیا کو بچائیں۔

آریہ سماج کا مندر دیویوں اور مہاپرشوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، صرف آریہ سماجی ہی نہ آئے تھے، بلکہ سناتن دھرمی بھی تشریف لائے تھے۔ آج اس ہولناک واقعہ نے آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کا آپس میں ملاپ کرا دیا تھا، چند سکھ اپنی کرپانوں کو سنبھالے ہوئے، مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے،

ہندو قوم خطرے میں تھی، اور حیرت تو اس بات کی تھی، کہ ایک ہندو ریاست میں اس قسم کا تیاچار ہو جائے، ہندوؤں کے ہوتے ہوئے، ایک مسلمان کی یہ ذلیل حرکت۔ اگر اس قسم کی حرکتوں کو روکا نہ گیا، تو ایک دن یہ ریاست مسلمانوں کی ہو جائے گی۔ پاکستان کا خواب مکمل ہو جائے گا۔ مجمع میں ایک ہنگامہ برپا تھا، لوگوں میں جوش و خروش تھا، فضا نعروں سے گونج رہی تھی، سوامی دیانند کی جے، اور ہر ہر مہا دیو کا نعرہ یکے بادیگرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ آج ہندو دھرم پر مر مٹنے کی تمنا تھی۔ بابا کے عاشق کو جان سے مار دینے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ اور بابا کو اس مندر میں واپس لانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔

آریہ سماج کے سکریٹری نے زور سے میز پر مکا مارا، ہال میں سناٹا چھا گیا، سکریٹری کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، اس نے کھدر کی پگڑی کو سنبھالتے ہوئے کہا

" سجنو، دیویو، اور مہا پرشو آج ہمارے دیش پر ایک بپتا آن پڑی ہے، وہ مصیبت کیا ہے۔ جس نے ہم سب کو آج یہاں اکٹھا کیا ہے، شاید آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں، لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ یہ ریاست ہندوؤں کی ہے، اس کا راجہ ہندو ہے، اس کا وزیر ہندو ہے۔ اس کا سپرنٹنڈنٹ پولیس ہندو ہے، اس کا ہندو گورنر ہے۔ اس کا تحصیلدار ہندو، اس کا تھانیدار ہندو، لیکن ان باتوں کے باوجود، ایک مسلمان چھوکرا ایک ہندو لڑکی کو بھگا کر لے جائے ؟ گو اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس ریاست میں ۹۵ فی صدی مسلمان بستے ہیں، لیکن ریاست ہندوؤں

کی ہے ، اور میں یہ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں ، کہ مسلمان باقی ۵ فی صدی ہندوؤں کو مسلمان بنانے پر تلے ہوئے ہیں ، وہ چاہتے ہیں کہ پانچ فی صدی ہندو ، مسلمان ہو جائیں تاکہ گدی پر ہاتھ صاف کیا جائے ، اور مایا کا ایک مسلمان لونڈے کے ساتھ بھگایا جانا ، صاف ظاہر کرتا ہے ، کہ مسلمان خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں ، کیا ہم یہ کرنے دیں گے ــــ کیا ہم یہ کرنے دینگے (مجمع سے جواب آتا ہے) " کبھی نہیں ۔ کبھی نہیں " ۔ (اور پھر سوامی دیانند کی جے ، اور ہر ہر مہادیو کے نعرے) ۔ میں مایا کو جانتا ہوں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں ۔ نہایت ہی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی ہے ۔ وہ کبھی کسی مسلمان کے ساتھ بھاگ نہیں سکتی ، اس کی رگ رگ میں ہندوؤں کا خون لہریں مارتا ہے ۔ وہ دونوں وقت سندھیا کرتی تھی ۔ اور وید منتروں کا پاٹھ کرتی تھی ۔ اس کی زبان سے میں نے کبھی کوئی بُرا شبد نہیں سنا ۔ پھر وہ کس طرح ایک غریب آوارہ مسلمان لونڈے کے ساتھ بھاگ سکتی ہے ۔ یہ مسلمانوں کی چال ہے ، ان کی شرارت ہے ، آج مایا گئی ، کل شہر کی اور لڑکیاں بھگائی جائیں گی ، بھدر پرشوں یہ مایا کی عزت کا سوال نہیں ، بلکہ قوم کی عزت کا سوال ہے ، اس وقت ہندو دھرم خطرے میں ہے ، ہندوؤں کی ریاست ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے ۔ راجہ ہندوؤں کی پرواہ نہیں کرتا ، وہ مسلمان مشیروں کی بات پر عمل کرتا ہے ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم آپس میں متحد ہو جائیں ـــــ اور اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کریں ۔ میں چند تجویزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں ۔

(۱) مایا کو واپس لانے کے لئے چندہ اکٹھا کیا جائے ۔ دیویوں اور سجنوں

کو چاہیئے کہ وہ دل کھول کر چندہ دیں۔

(۲) بابا کو واپس لانے کے لئے ایک وفد تیار کیا جائے گا، اس وفد میں ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے، جو ضرورت کے وقت جان پر بھی کھیل سکیں۔

(۳) ہر محلے میں ایک ٹولی بنائی جائے، جو رات کے وقت ہندو محلوں میں پہرہ دیا کرے۔

(۴) ہندوؤں کی لڑکیاں مسلمان محلوں میں نہ جایا کریں۔

(۵) اگر ہو سکے، تو خفیہ طور پر، ڈنڈوں، برچھیوں اور بندوقوں سے اپنے آپ کو مسلح کیا جائے۔

کیا آپ کو یہ تجویزیں منظور ہیں ... ... مجمع سے جواب آیا: "منظور ہیں"۔ بولو سوامی دیانند کی جے، آریہ ورتا کی جے، ہر ہر مہادیو، مجمع میں سے ایک سکھ چلایا۔ جو بولے سو نہال، مجمع چلایا، ست سری اکال ——

اور اس طرح نعروں سے سارا مندر گونج اٹھا — مسلمان ان تجویزوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ انھوں نے مسجد میں جلسہ کیا۔ وہ خوش تھے کہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بھگا لے گیا، وہ اُس مسلمان نوجوان کے گلے میں ہار ڈالنا چاہتے تھے، اور اگر ان کا بس چلتا، تو وہ لڑکے اور لڑکی کا جلوس نکالتے، لیکن ریاست ہندوؤں کی تھی، اس لئے بے چارے بے بس تھے۔ لیکن ان کے چہروں سے فتح اور کامرانی کے آثار ٹپکتے تھے۔ یہ یقیناً اسلام کی فتح تھی، مسلمان اخوت اور آزادی کے پرستار ہیں، ہر شخص کو وہ اپنا بھائی

تصور کرتے ہیں۔ دنیا کا سب سے پہلا مذہب اسلام ہے، اور اسلام ہی رہے گا
اس واقعہ کے بعد ریاست کے مسلمان بازاروں میں اکڑ اکڑ کر چلتے۔ اور بنئے
دکانوں پر بیٹھ کر کڑھتے رہتے۔ کاش وہ کچھ کر سکتے۔ وہ ان مسلمانوں کو ہلاک
کرنا چاہتے تھے۔ کتنے بدتمیز ہیں یہ لوگ، سود پر روپے ہم دیں، شادی بیاہ کو
لئے، روپے ہم دیں۔ جب کبھی کوئی مصیبت آئے، تو روپے لینے کے لئے،
ہمارے پاس آتے ہیں۔ لیکن اب انکی یہ دلیری، کہ ہماری لڑکیوں کو اغوا کرے
جاتے ہیں۔ ہماری بلی اور ہم سے میاؤں —— سنا سیٹھ جی، شہر کے مسلمان
مایا کو ایک بنگلہ بنوا کر دے رہے ہیں۔ کھیتی باڑی کے لئے انھیں زمین دے
رہے ہیں، اور الیکشن میں اس چھوکرے کو امیدوار کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اس طرح
بنتی ہیں قومیں، اسے کہتے ہیں اتفاق ... ...

شہر کے ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں چند نوجوان چائے پی رہے تھے۔
قصہ وہی مایا کا۔

سنا جگدیش، مایا کو احمد بھگا کر لے گیا،" سکھ چین سنگھ نے آہ
بھر کر کہا۔

ارے احمد کہاں بھگا کر لے گیا، سالی خود اس کے ساتھ بھاگ گئی
جگدیش نے چائے کا گھونٹ پی کر کہا۔

وہ تو مسلمان بھی ہو گئی، اور دونوں کی مسجد میں شادی ہو گئی۔ سکھ چین
سنگھ نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ارے مسلمان ہو گئی تو کون سی آفت آگئی " اندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" ہت تیرے کمیونسٹ کی، تم تو لامذہب ہو میاں "

تمھارے ایسے ہندؤں کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی، ارے ان کی تعداد ہی کیا تھی، اب جدھر نگاہ ڈالو، ترکی ٹوپی نظر آتی ہے، اللہ اکبر کا نعرہ کانوں سے ٹکراتا ہے، صبح بستر سے اٹھو، تو مندر کی گھنٹی کی جگہ اذان سنائی دیتی ہے۔ تم کہتے ہو، ہوا ہی کچھ نہیں۔ دن دھاڑے ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بھگا کر لے جائے، اور مسجد میں جا کر شادی کرے، اور تم کہتے ہو، ہوا ہی کچھ نہیں، میں پوچھتا ہوں۔ اور ہو گا کیا۔

"سنا ہے، مایا احمد سے محبت کرتی ہے"، جگدیش بولا۔

" جھوٹ بالکل جھوٹ، میں کہتا ہوں سفید جھوٹ، ارے وہ تو رنڈی ہے۔ طوائف ہے، طوائف کسی سے محبت نہیں کرتی۔ رنڈی کا کوئی مذہب ہوتا ہے!" سکھ چین نے متفکرانہ انداز سے یہ فقرے کہے

" تو پھر تمھاری بلا سے، اگر وہ مسلمان ہو گئی، تو تمھیں کیا "

" میاں وہ اپنی مرضی سے مسلمان نہیں ہوئی، بلکہ زبردستی مسلمان کی گئی ہے، مسلمانوں کی بڑی گہری چال ہے، جو تم نہیں سمجھ سکتے "

" ایک لڑکی کے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، میں کہتا ہوں" گر سارے ہندو مسلمان ہو جائیں، تب بھی کچھ نہیں ہو گا،

سارے مسلمان ہندو کیوں نہ ہو جائیں " سکھ چین چلایا۔

کیا مسلمانوں کے ہندو ہو جانے سے تمھاری تکلیفیں کم ہو جائیں گی، بھوک اور بے کاری مٹ جائے گی، ظلم اور استبداد کم ہو جائے گا۔ ارے کوئی کام کی بات سوچو۔ ان دقیانوسی خیالات کو چھوڑو۔ اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں جگہ نہ دو

(ہلکی سی ہنسی ہنستا ہے)

ہنسو اور خوب زور سے ہنسو۔ لیکن میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں، کہ میں راجپوت ہوں۔ میری رگوں میں پرتھوی راج چوہان کا خون دوڑ رہا ہے، میرے باپ دادا نے یہ زمین فتح کی تھی، ان دنوں یہاں ملیچھ رہا کرتے تھے جس شخص نے سر اٹھایا، اُسے کچل دیا گیا، مسلمانوں کو زندہ درختوں سے لٹکا دیا گیا۔ ان کے جسموں میں بھوسہ بھر کر شہر بھر میں پھرایا گیا۔ نیزوں پر ان کے سروں کو رکھ کر شہر میں گھمایا گیا۔ تب جا کر یہ لوگ سیدھے ہوئے تھے، سکھ چین نے فاتحانہ انداز سے کہا۔

جب آزادی کا گلا گھونٹا جاتا ہے، تو ہر فاتح اسی طرح کرتا ہے، تمھارے باپ دادا نے کوئی نئی بات نہیں کی، غزنوی، تیمور اور بابر نے بھی یہی کیا تھا۔ انگریزوں نے یہی کیا، ہٹلر نے یہی کیا، اگر تمھارے باپ دادا کا ظلم اُن ملیچھوں پر جائز تھا، تو آج اس ظلم کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے،، اندر نے جل کر کہا

(ان سنی کر کے) میں ہندستان میں ہندوؤں کی حکومت چاہتا ہوں،، سکھ چین نے مدبرانہ انداز سے کہا۔

مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔

تم لوگوں نے پاکستان کا جھگڑا اٹھایا۔ اگر گاندھی جناح سے نہ ملتا، تو جناح کبھی اتنا مشہور نہ ہوتا۔

تم نہیں جانتے کہ پاکستان کے نعرے سے ہماری سیاسی زندگی میں ایک ایسی تبدیلی آگئی ہے، جس کی اشد ضرورت تھی " اندر بولا

اچھا بابا۔ تم سارا ہندستان مسلمانوں کو دے دو، لیکن اس ریاست میں ہندؤں کا راج رہے گا، اور مایا واپس آئے گی اور ضرور آئے گی!

کیا تم مایا کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو،

میں ایک بدچلن عورت کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار نہیں'

کیا اس شہر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو مایا کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جیسے موت نے اپنے مہیب پھندے ان کے گلوں میں ڈال دیئے ہوں، اور وہ سب بے زبان اور گنگ سے ہو کر رہ گئے ہوں۔

اور تم جگدیش،۔ اندر نے خاموش فضا کو توڑتے ہوئے کہا۔

میں۔ میں۔ مایا کو اپنی داشتہ بنا سکتا ہوں، لیکن گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ سالی ہے خوبصورت، ارے جسم دیکھو، تو تڑپ اٹھو۔ اس دن چشمہ پر ملی تھی، کیا چیز ہے۔ اللہ کی قسم، اندر، عورت ہے عورت۔ معلوم نہیں وہ ہندو ہے یا مسلمان —— اگر میرا باپ مر گیا ہوتا، تو میں نے مایا سے کب

کی شادی کر لی ہوتی، کیا بتاؤں اندر، میں مایا سے کتنی محبت کرتا ہوں ... ...
محبت! شاید یہ محبت نہیں، یہ جنوں ہے، اس جنوں نے میری کتنی راتوں کو
برباد کیا، میں اس کے جسم کو چاہتا ہوں، اپنے بازوؤں میں بھینچنا چاہتا ہوں اس
کے جسم کے ہر نقش کو دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے جسم کے لمس سے محظوظ ہونا
چاہتا ہوں۔ اس تمنا، اس خواہش کو محبت کہہ لو۔ یا ہوس یا جنسی بھوک، لیکن
یہ نقلی چیز نہیں، خدا کی قسم یہ نقلی چیز نہیں، یہ میرے دل کی خواہش ہے، میرے
خون کی جھلک ہے، میری روح کا پرتو ہے، کمبخت باپ نہیں مرتا میں اچھی
طرح جانتا ہوں کہ اگر میں نے مایا سے شادی کر لی، تو باپ دادا کی جائیداد
سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور میں زندہ بھی اسی جائیداد پر ہوں، اسی جائیداد کے
سہارے جیتا ہوں، اس لئے باپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا میں بزدل
ہوں، واقعی بزدل ہوں، میں فیصلہ نہیں کر سکتا، محبت کرتے ہوئے محبت
کا گلا گھونٹ رہا ہوں۔ میں مایا کو جانتا ہوں ـــــ اچھی طرح جانتا ہوں، مگر صرف
جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر آدمی عملی طور پر کچھ نہ کر سکے، یہ والدین کتنے ظالم
ہوتے ہیں؟ اور یہ آریہ سماجی، اور یہ مذہب (ہنستا ہے) سکھ چین سنگھ
ـــ آج تمھیں ہندو دھرم یاد آ گیا۔ کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا تم
نے، کتنی بار تمھاری آغوش میں مسلمان عورتیں آئیں۔ اور تم نے ان غریب
لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ اور یہ بی۔ اے کی ڈگری کس طرح لی، یہ روپے تمھیں
کون بھیجتا تھا، تمھارا بھائی اور یہ روپے، یہ کس کا خون ہے، ان دہقانوں کا
ان مسلمانوں کا، جن کی آبادی اس ریاست میں ۹۵ فیصدی ہے، تمھارے

گھر میں مسلمانوں کا مکھن آیا۔ ان کی کلاڑیاں آئیں، انھوں نے دودھ بھیجا، انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے روپے رشوت کے طور پر دیئے، لگائے بھینسوں کے لئے گھاس بھیجا۔ لیکن دھرم اس وقت خطرے میں نہ تھا۔ اُس وقت راجپوتوں کی شان کو کیا ہوا تھا۔۔ تم کہتے ہو۔ تم راجپوت ہو، سالے۔ کمینے۔ کہیں کے ــــــــ نکل جاؤ یہاں سے۔

اُسی شام، شہریوں کا وفد مایا کے پاس پہنچا۔ وفد میں شہر کا چودھری تھا آریہ سماج کا سکریٹری اور نوجوانوں کا نمائندہ جگدیش، اور ایک مولوی صاحب جو ریاست کے راج کی طرف سے بھیجے گئے تھے، تاکہ ہندو مایا کو زبردستی اٹھا کر نہ لے آئیں۔

مایا اور احمد ایک کچے سے گھر میں رہ رہے تھے، جب وہ دروازہ کھٹ کھٹایا گیا، تو احمد بپھرے ہوئے شیر کی طرح دروازے کی طرف لپکا، اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔

دروازہ کھلا

سکریٹری نے احمد سے کڑک کر پوچھا: کہاں ہے مایا؟

آیئے سکریٹری صاحب آیئے، تشریف لایئے۔ مایا اندر سے بولی۔

چاروں اندر چلے گئے

فوراً تیار ہو جاؤ مایا، ہمارے ساتھ اسی وقت چلو!

احمد چھرا لیکر سکریٹری کی طرف لپکا۔

"احمد" - مایا چلائی

اور احمد وہیں رک گیا "خدا کی قسم مایا میں تمھیں کبھی نہ جانے دونگا، کبھی نہیں، میں ان سب کو جان سے مار دونگا۔ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا، ان سے کہہ دو کہ چلے جائیں یہاں سے،

چپ رہو احمد،

فرمایئے سکریٹری صاحب، کیا کام ہے؟

میں تمھیں لینے آیا ہوں

کس لئے؟

ایک ہندو عورت مسلمان کے ساتھ نہیں رہ سکتی،

میں احمد سے محبت کرتی ہوں،

کیا سارے شہر میں تمھیں کوئی ہندو مرد نہیں ملا۔

ملے اور بہت ملے ... ... آپ بیٹھ جایئے نا ... ... آپ بھی چودھری صاحب، اور آپ جگدیش صاحب ——— میں غریب ہوں میرے پاس صوفہ سٹ نہیں، گدی نہیں، قالین نہیں ——— خیر اس چارپائی پر تشریف رکھئے۔

فوراً تیار ہو جاؤ مایا ——— مندر میں تمام شہر کے لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں، تمھیں دوبارہ ہندو بنانے کے لئے سب تیاریاں کر لی گئی ہیں"

ہندو بنانے کے لئے (ہنستی ہے) ——— سکریٹری صاحب میں

نہیں جاؤں گی، میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں، میں اس کے پاس رہوں گی
کیا آپ کو اعتراض ہے"۔

"ہاں اعتراض ہے، ہندو دھرم یہ اجازت نہیں دیتا کہ کوئی ہندو
لڑکی کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرے"۔ سکریٹری صاحب نے جوش میں
آکر کہا۔

"اس سے پہلے آپ کہاں تھے، کیا آپ وہ دن بھول گئے جب
میں آپ کے پاس آئی تھی، اور گڑگڑا کر نوکری کے لئے درخواست کی تھی، اور
یہ بھی کہا تھا کہ میری شادی کرا دیجئے۔ اور آپ نے گالیاں دے کر گھر سے
باہر نکال دیا تھا۔ اور کہا تھا۔ پہلے چال چلن درست کر کے آؤ۔ اور پھر میں
چودھری جی کے پاس گئی تھی، آپ نے مجھے اپنے گھر رکھا، میں ان کے گھر
جھاڑو دیتی رہی، ان کے بچوں کو نہلاتی، کھلاتی رہی۔ ان کے برتن صاف کرتی
رہی، اور ایک رات آپ شراب پی کر میرے کمرے میں گھس آئے، اور زبردستی
میرا منہ چوم لیا۔ رات اپنے سنگ سونے کے لئے کہا، میں نے انکار کیا، اور
آپ نے اسی رات مجھے گھر سے نکال دیا۔ باہر سخت سردی تھی، اندھیرا گھپ
اندھیرا، اور کڑاکے کی سردی، اور میں تمام رات گھومتی رہی۔ ادھر اُدھر۔ اس
دن کے بعد میں ہر افسر کے پاس گئی، ان سب لوگوں نے میری بے عزتی کی، اپنے
ساتھ سلایا اور آوارہ عورت کہہ کر گھر سے باہر نکال دیا۔ اس شہر کے ہر شخص نے
میرے ساتھ محبت کی ہے، شراب پی کر میرے جسم کی تعریفیں کی ہیں، اپنے
معاشقے سنائے ہیں۔ اپنی بدصورت بیوی کا رونا رویا اور جب صبح ہوتی

تو یہی لوگ مجھے گھر سے باہر نکال دیتے ——— اور آپ جگدیش صاحب، آپ خاموش کیوں ہیں۔ آپ نے کہا تھا، کہ میں آپ کی داشتہ بن جاؤں۔ آپ مجھے مکان لے دینگے۔ آپ پندرہ روپے خرچ دیں گے، اور ہر روز مجھے آپ کے ساتھ سونا پڑے گا ——— کیا میں لکڑی کی بنی ہوئی ہوں، کیا میں میز ہوں، تپائی ہوں، کرسی ہوں ——— آخر آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں ... اور آپ یہ کہتے رہے کہ آپ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتے ہیں، لیکن آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے، کیونکہ آپ کے والدین مجھے ایک بدچلن عورت سمجھتے ہیں ——— آخر شہر کا کونہ کونہ چھان کر مجھے یہ شخص ملا ——— پرماتما کی قسم سکریٹری صاحب، میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں، یہ شخص مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ شخص جانتا ہے کہ اس سے پہلے میں کافی آدمیوں کے ساتھ سو چکی ہوں، لیکن پھر بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے۔ یہ کس قسم کا عشق ہے۔ سمجھائیے نا آپ اسے۔ ہر روز جنگل میں جاتا ہے، لکڑیاں کاٹتا ہے، اور بازار میں بیچتا ہے، اور جو کچھ کماتا ہے مجھے دیتا ہے، مجھے رنڈی نہیں کہتا مجھے طوائف نہیں کہتا ——— میں اس کے لئے روٹی پکاتی ہوں، اور جو کچھ کر سکتی ہوں کرتی ہوں، ہم دونوں خوش ہیں، پرماتما کے لئے ہماری خوشی نہ چھینئے،

"لیکن یہ مسلمان ہے"۔ سکریٹری نے چیخ کر کہا

"اس کا مجھے علم نہیں، میں نے اس کے ساتھ اس لئے شادی نہیں کی کہ یہ مسلمان ہے۔ نہ میں قرآن پڑھ سکتی ہوں، نہ قرآن کی آیتوں سے واقف ہوں نہ کبھی مسجد گئی ہوں نہ جاؤں گی۔ میرا نام مایا ہے اور مایا ہی رہے گا۔

لاحول ولا قوۃ۔ کفر بکتی ہے کفر، مولوی صاحب نے جل کر کہا
سنئے تو سہی مولوی صاحب، مجھے ایک مرد چاہئے تھا وہ مل گیا
یہ مرد مسلمان ہے یا ہندو۔ اس بحث سے مجھے کوئی سروکار نہیں، ہاں اتنا ضرور
کہوں گی کہ آپ لوگوں سے یہ بہتر انسان ہے ـــــــ اب آپ جائیے اور
اسی وقت چلے جائیے، میں آپ کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی ـــ اگر
آپ نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی، تو ہم اُسے
جان سے ماردیں گے ... (پھر اونچی کر کہتی ہے) چلے جائیے یہاں سے

دوسرے دن شہر کے مسلمان کہہ رہے تھے: ارے وہ تو رنڈی ہے
رنڈی، سالی کمینی کہیں کی۔ رنڈی کا کوئی مذہب ہوتا ہے،
اُسی شام ہندوؤں اور مسلمانوں کا جلسہ ہوا جس میں یہ ریزولیوشن پاس
کیا گیا۔ کہ احمد اور مایا کو اس شہر سے نکال دیا جائے۔ اس پاک زمین پر دونوں
کے رہنے کا حق نہیں

صرف ایک کامریڈ

میں نے پریم کو دس سال کے بعد دیکھا۔ دس سال پہلے ہم دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان دنوں پریم کافی خوبصورت تھا۔ اکثر وہ ایک اچھے نفیس سوٹ میں ملبوس رہتا، وہ اکثر چپ رہتا، اور چہرے پر عجیب قسم کا خول چڑھائے رہتا۔ اس کے خوبصورت چہرے اور خوشنما پوشاک کو دیکھ کر اکثر مجھے محسوس ہوتا کہ بہت لڑکیاں پریم سے محبّت کرتی ہوں گی۔ ان دنوں ہمارے کالج میں ایک نئی نویلی لڑکی داخل ہوئی تھی، اس کے کالج میں داخل ہوتے ہی کالج کی زندگی میں ایک نئی رونق آ گئی تھی۔ لڑکے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ہو کر آتے، کوئی نئی ٹائی بائی لگا کر آتا۔ تو کوئی نیا جوتا خرید کر لاتا۔ کسی کے ہاتھ میں

گلاب کا پھول، تو کسی کا طرہ آسمان کی طرف نگاہ کئے ہوئے ہوتا۔ لڑکے اکثر کالج کی گیلری میں کھڑے ہو جاتے اور جب یہ لڑکی باقی لڑکیوں کے ساتھ گذرتی تو سبھی ایک آہ بھر کر منتشر ہو جاتے، سب کے دلوں میں خواہش پیدا ہوتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس لڑکی سے راہ و رسم پیدا کرے، لیکن لڑکی کسی کی طرف آنکھ آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتی تھی۔ وہ اکثر ایک سفید شلوار، سفید قمیص اور سفید دوپٹہ اوڑھ کر آتی، اس کی آنکھیں موٹی موٹی اور دلزیب، یوں ہی انجان اور خوبصورت میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا، لیکن پہلی نظر میں یہ جان لیا کہ یہاں ہمارے بس کی بات نہیں۔ یوں ہی سر پھوڑنے سے کیا واسطہ۔ چپکے سے ہم اس کی یاد کو لئے ہوئے رات کو سو جاتے۔ اور صبح ہوتے ہی کالج کی طرف کوچ کرتے۔

ایک دن ہمیں یہ اطلاع ملی کہ پریم اور رام کور (یہی اس لڑکی کا نام تھا) اکٹھے سینما دیکھنے گئے تھے، اور کالج کے منچلے نوجوانوں نے ان دونوں کو اکٹھا دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کالج میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ دونوں کے عشق کے چرچے ہونے لگے۔ اگر کبھی پریم نئی ٹائی لگا کر آتا تو اس کے دوست احباب اسے خوب چھیڑتے۔

"میاں، واقعی تم خوش قسمت ہو۔ ایسی لڑکی پر ہاتھ صاف کیا کہ زندگی بھر نشہ رہے گا"۔ "ارے بھائی خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا۔ تم خود خوبصورت ہو اور لڑکی بھی ملی تو تم سے بھی بڑھ چڑھ کر۔"

"واقعی قسمت کے دھنی ہو۔"

"زندگی میں اور کیا چاہیئے۔ تمہارے پاس روپیہ ہے، عورت ہے، اور

تمہارے ماں باپ امیر ہیں۔ کس بات کی کمی ہے ؟"

اور پریم ان سب کی باتیں سُنتا اور مسکرا دیتا، اور کبھی کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتا اور میں کبھی کبھی یار دوستوں کی باتیں سُن کر جھنجھلا اٹھتا اور پریم سے کہتا، کہ تم ان کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے" اور وہ پھر خاموش ہو جاتا، اور ہنس پڑتا، مجھے اس کی ہنسی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، اگر تم امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہو، اور تم خوبصورت ہو، اور تمہیں ایک اچھی لڑکی ملی ہے، تو لوگ کیوں جلتے ہیں، ان کے دلوں میں حسد کی آگ کیوں بھڑک اٹھتی ہے، تمہارے خوبصورت کپڑوں کو دیکھ کر ان کے دل میں کیوں ناسور پیدا ہو جاتا ہے معلوم نہیں یہ کس قسم کے دوست ہیں!

اور پریم کسی بات کا جواب نہ دیتا اور ہنس کر چپ ہو جاتا۔

میری اور پریم کی دوستی بہت گہری دوستی نہ تھی، یوں ہی ایک قسم کی واقفیت سمجھئے، یعنی ہم دونوں اکٹھے پڑھتے تھے، ایک کلاس میں ایک ہی کالج میں۔ اور چونکہ میں طلبار کی یونین میں کافی حصّہ لیتا تھا، اور جب کبھی کالج میں مشاعرہ ہوتا، یا کوئی DEBATE ہوتی، تو میں ضرور حصّہ لیتا، اگر کالج میں کوئی ہڑتال وغیرہ کا سلسلہ ہوتا، تو میں سب سے آگے ہوتا۔

ایک بار طلبا کی یونین کا چناؤ ہوا، تو یکایک مجھے محسوس ہوا کہ پریم بھی طلبا کی یونین کے چناؤ میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لے رہا تھا۔ دراصل مجھے اس قسم کے لوگوں سے نفرت سی ہے، جو سوٹ بھی پہنیں نکٹائی بھی لگائیں اور بغل میں لڑکی کو دبا کر سینما بھی دیکھیں۔ بہترین وسکی پئیں اور رات کو لڑکیوں کے

ساتھ گلچھرے اڑائیں، اور جب کبھی مزدوروں کی ہڑتال ہو، جلسہ یا جلوس نکلے، تو یہی لوگ کھدر کے کپڑے پہن کر سب سے آگے ہو جاتے ہیں اور کام کرنے والوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کا خیال پریم کے متعلق تھا میرا۔ ارے میاں کتنی ٹھاٹھ دار ایک عالیشان کوٹھی میں رہتے ہو، کار میں کالج آتے ہو، گالوں پر ٹماٹر کی سی سرخی ہے، اور بغل میں ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اور ان باتوں کے باوجود جب کبھی موقع ملتا ہے تو سرمایہ داروں کے خلاف زہر اُگلتے ہو۔ مزدوروں اور کسانوں کے حق میں ترانے گاتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قسم کا کریکٹر ہے"
بہر حال کالج کی زندگی کچھ ایسی ہی تھی۔ کبھی میں نے پریم کو ایک سوٹ میں دیکھا، اور کبھی کھدّر کے کپڑوں میں۔ لیکن زیادہ تر میں نے اسے خوشنما کپڑوں میں دیکھا، اسے اچھا کھانا کھاتے دیکھا، اسے ایک کوٹھی میں رہتے ہوئے دیکھا، اسے ایک کار سے اترتے ہوئے دیکھا، اور اسے رام کور کے ساتھ فلرٹ کرتے ہوئے دیکھا اور اسے نہایت آرام سے بی، اے کی ڈگری پاس کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک تبسم تھا۔ نہایت اطمینان اور سکون بھرا تبسّم جس سے زندگی کی محبت کی جھلک نمایاں تھی۔

اور اس کے بعد میں نے اسے آج دیکھا۔ دیکھتے ہی مجھے ایک دھچکا لگا در اصل میں پریم کو پہچان نہ سکا۔ وہ خوبصورت پریم، جس کی آنکھوں میں سُندرتا تھی، آج اندر دھنس گئی تھیں۔ اس کے سر سے بال اُڑ گئے تھے۔ اس کے چہرے سے نقاہت اور غربت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے گال پچک گئے تھے۔ وہ میری طرف دیکھتے ہی مسکرا پڑا۔ گو مسکراہٹ وہی تھی لیکن آج اس مسکراہٹ میں ایک

تلخی تھی، ایک زہر تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس مسکراہٹ میں ایک توانائی ایک قوت تھی، ایک خلوص تھا جس کا مجھ پر فوراً اثر پڑا۔

"کہاں رہے تم اتنے عرصہ" میں نے پریم سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ "ارے یار تم اتنے بدل گئے ہو کہ میں تمہیں پہچان نہیں سکا، بھائی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"بتاؤ تو سہی۔ آؤ چائے کا ایک کپ پئیں۔"

اور ہم دونوں ریستوران میں چلے گئے، ریستوران میں کافی بھیڑ تھی لیکن ہمیں ایک کونے میں دو کرسیاں مل گئیں۔ دونوں چپکے سے بیٹھ گئے اور وہ مُسکرانے لگا۔

"تم جلدی بتاؤ تمہیں ہوا کیا۔"

"ارے بھائی۔ کچھ بھی نہیں، ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"تمہارا حلیہ بدل گیا ہے، تمہاری صورت سے ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے تمہاری عمر پچاس سال ہو گئی ہے۔"

"ان باتوں میں اکثر آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے۔"

"کون سی باتیں۔"

"یہی باتیں۔"

"بھائی کھل کر باتیں کرو۔"

اس نے چائے کا کپ اُٹھایا، اور کہنے لگا "یہ تم جانتے ہو کہ میرا باپ اچھے پیسے کماتا تھا، اور میں نے زندگی میں اچھے دن بھی دیکھے، لیکن شروع ہی سے

مجھے روپیہ سے محبت نہ تھی، اس لئے کبھی کبھی میں تمہارے ساتھ یونین میں کام کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ مجھے موقع شناس سمجھتے تھے، اور مجھے ان باتوں سے بہت چڑ تھی، دراصل میں ان دنوں بھی نہایت خلوص سے یقین رکھتا تھا۔ کہ دنیا کے چند آدمیوں کو اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ حق سب کو ملنا چاہئے۔ ان دنوں میں کرتا، تو کیا کرتا۔ چند کتابیں اشتراکیت پر پڑھی تھیں، چند فقرے MARXISM سے یاد کئے تھے، انھیں کو یاد کر کے، پڑھ کر ہمیں کچھ کچھ سیاسی تعلیم ملی۔ لیکن اس دوران میں رام کور مل گئی۔ اور میری زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہو گئی لڑکی خوبصورت تھی یہ تم جانتے ہو۔ اور مجھے بہت چاہتی تھی، لیکن اُسے ان باتوں سے سخت نفرت تھی کہ میں کالج کی بحثوں میں حصہ لوں، یا جلسے یا جلوسوں میں شرکت کروں، یا مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ مل بیٹھ کر باتیں کروں۔ دراصل وہ یہ چاہتی تھی کہ میں ایم اے کر لوں، اور ایک کالج میں پروفیسر ہو جاؤں اور اس کے ساتھ شادی کر کے آرام کی زندگی بسر کروں رام کور اچھے کپڑوں سے محبت کرتی تھی، اچھی کار کو دیکھ کر وہ پھڑک اٹھتی تھی، نوکر چاکروں کی وہ بہت دل دادہ تھی، سینٹ کریم پہ فدا ہونے والی، اور بچّوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ مجھے اچھے کپڑے پہننا برا نہیں لگتا تھا، دراصل میں ہمیشہ اچھا لذیذ کھانا چاہتا ہوں، اور ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہوں، شادی کرنا چاہتا ہوں، لیکن ان دنوں میری ملاقات ایک اور نوجوان سے ہو گئی اس کا نام کل بھوشن تھا۔ اس لڑکے نے میری کایا پلٹ ڈالی۔ اس کی باتوں نے میری زندگی کا راستہ بدل ڈالا، وہ خود ایک ایڈوکیٹ لڑکا تھا۔ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ کافی خوبصورت اور گورا چٹا جب کبھی کالج میں یا باہر مزدوروں کے جلسے میں تقریر کرتا تو سارے مجلس میں ایک سنّاٹا

چھا جاتا، اس کی باتیں ٹھوس تھیں، اُن میں شک کی گنجائش نہ تھی۔ اُن باتوں میں
خلوص تھا۔ ایثار تھا، وہ ایک ان پڑھ ورکر نہ تھا، اس لئے مجھے اس بات کا پورے
طریقے سے احساس کرا دیا کہ ایک ذہین پڑھے لکھے آدمی کو یہ نہیں پہونچتا کہ وہ اکیلا
اس دنیا میں عیش کرے۔ اگر وہ حساس ہے تو اسے باقیوں کا ضرور خیال کرنا ہوگا۔
اپنے ملک کو دیکھ لو کتنی بے کاری ہے، کتنی گندگی ہے، کتنی غربت ہے، لوگوں کو پیٹ بھر
کھانا نہیں ملتا۔ کپڑا پہننے کے لئے نہیں ملتا، نفع خوروں نے زندگی کو جہنم بنا دیا ہے
اور موت چاروں طرف سائیں سائیں کرتی پھر رہی ہے، مزدور کام کرتا ہے، کسان
ہل چلاتا ہے اور عیش کون کرتا ہے صرف یہ اونچے مکانوں والے، یہ کوٹھیوں والے
یہ کاروں والے، دن بدن کمینگی اور رذالت بڑھتی جا رہی ہے، زندگی میں دھوکا
ہے فریب ہے، عیاری ہے، چالاکی ہے، ان باتوں کو مدنظر رکھ کر میں کسی پارٹی میں
شریک ہو گیا۔ پارٹی میں شریک کیا ہوا کہ رام کور نے مجھے چھوڑ دیا، اس نے ایک
امیرزادے سے شادی کر لی، باپ نے مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ "اب دوبارہ میرے
گھر نہ آنا۔ مجھے ایسے بیٹوں کی ضرورت نہیں۔" لیکن میں دُھن کا پکّا تھا، اپنے ارادوں
کو مٹنے نہ دیا۔ یہ شمع جو روشن ہو چکی تھی وہ ان پھونکوں سے گل نہ ہونے پائی
اور اس عرصہ میں کتنی بار گرفتار ہوا، جیل میں ٹھونسا گیا، کتنی بار مار پیٹ ہوئی۔ اور
اس کا نتیجہ۔ یہ میری گنجی کھوپڑی، یہ دھنسی ہوئی آنکھیں، یہ پچکے ہوئے گال؛ اور
ایک نحیف اور کمزور جسم۔

"چائے کا ایک پیالہ اور منگوانا، دوست"

"بوائے، ایک کپ اور"

"کیا تم اب بھی ان باتوں میں یقین رکھتے ہو؟"

وہ پھر ہنس پڑا۔ اور اب کے کھکھلا کے ہنس پڑا"،

"اور تم کیا کرتے رہے دوست"، پریم نے مسکرا کر پوچھا۔

"ارے یار کچھ نہ پوچھو"

"بتاؤ تو سہی"

"کچھ نہیں۔ یوں ہی جھک مارتا رہا"

"بتاؤ تو سہی، کافی خوبصورت اور ہٹے کٹے ہو گئے ہو"

"بھائی جب لاہور میں کچھ نہ کر سکا تو دہلی کی طرف رخ کیا، جب دہلی سے بے یار و مددگار نکلا تو لکھنؤ کی جانب قدم اٹھائے اور جب وہاں سے نکالا گیا تو بمبئی آ پہنچا"

"کیا کرتے ہو یہاں"

"ایکٹر بن گیا ہوں"

"جبھی خوبصورت ہو گئے ہو۔ لونڈیاں ملتی ہیں یا نہیں؟"

"بہت سی۔ لیکن دوست زندگی میں لطف نہیں آیا"

"لطف کسے کہتے ہیں"، اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تمہیں تو معلوم ہونا چاہیئے"

"ایک عرصے سے اس لطف سے بے گانہ ہو گیا ہوں۔ دراصل یہ بیگانگی رہی ہے تو سوچ سمجھ کر۔ جان بوجھ کر اختیار کی ہے۔ ایک ایسی ریاست ہے جس کا صلہ شاید مجھے نہ مل سکے۔ شاید آنے والی نسلوں کو ملے"

"ایک کپ اور، چائے کے پیسے تو ہیں نا"

"جتنی مرضی چائے کے پیالے پیو۔ میرے پاس کافی پیسے ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں" پریم نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "اس جھگڑے کے بعد، اب فضا زیادہ صاف اور واضح ہو گئی ہے۔"

"کس جھگڑے کے بعد" میں نے پوچھا۔

"بھائی اس تقسیم کے بعد یہ ہندو مسلم فساد۔ یہ "آزادی" جو ہمیں ملی اور یہ نئی زندگی جو ہم نے اختیار کی، اس سے نظامِ زندگی پر کافی اثر پڑا۔ بڑے بڑے لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے، وہ لوگ جو محلوں میں رہتے تھے، اور مزدوروں اور کسانوں کی طرف آنکھ بھیر کر نہ دیکھتے تھے، آج خود سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ انھیں آج معلوم ہو گیا کہ دنیا کتنی چھوٹی ہے، زندگی روپے کے بغیر کتنی بے لطف اور بے رس ہوتی ہے۔ سیاست کا اثر کیسا ہوتا ہے، زندگی کی چال کیسی ہے۔ اور بھوک اور بے کاری زندگیوں کو کس طرح بے رنگ و بو بنا دیتی ہے شاید تم نہیں جانتے کہ میرے باپ کو اس تقسیم کے بعد لاہور چھوڑنا پڑا۔ اس کی کوٹھی چھن گئی، نوکری چھن گئی، وقار چھن گیا۔ عزت چھن گئی روپیہ گیا اور آج جب وہ بھاگ کر بمبئی آئے تو میرے ساتھ ٹھیرے۔ آج انھیں محسوس ہوا کہ جب آدمی کے ہاتھ سے دولت چھن جاتی ہے تو اس کی کیا پوزیشن ہوتی ہے۔ آج وہ کہنے لگے "پریم تم ٹھیک کہتے تھے اور ٹھیک کہتے ہو کہ زندگی میں صرف چند آدمیوں کو اچھی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں باقیوں کا بھی حق ہے کہ وہ اچھا کھانا کھائیں، اچھے کپڑے پہنیں اور اچھے گھروں میں رہیں۔ اور رام کور، اس بے چاری کا برا حشر ہوا۔ اس کے خاوند کو وہیں قتل کر دیا گیا، اور وہ دوڑتی بھاگتی اور جان بچاتی

دہلی آئی اور ایک اسکول میں پچاس روپے ماہوار پر نوکر ہو گئی۔ اب کے جب میں دہلی میں ایک جلسے میں تقریر کر رہا تھا وہ زور زور سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگا رہی تھی۔ در اصل جب انسان چوٹ کھاتا ہے تو پھر عقل آتی ہے یہ میں نہیں کہتا کہ ہر شخص نوکری چھوڑ کر، بیوی بچّوں کو چھوڑ کر، دیہات سدھار یا ایک نئے نظام کی تعمیر میں لگ جائے، لیکن دوست، یہ میرا یقین ہے، کہ پڑھے لکھے آدمی کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ جس زندگی کا ہم حصّہ بن چکے ہیں وہ بہت گندی ہے اس میں بہت کمینگی ہے، اس زندگی کو از سر نو تعمیر کرنا ہے، اس کی سڑی ہوئی جڑوں کو نکال کر ایک نئے پودے کو لگانا ہے، موت سے لڑ کر زندگی کو لینا ہے۔ یہ کام بہت کٹھن ہے لیکن لوگ کر رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب ہندو مسلم کی تفریق ختم ہو جائے گی اور جب زندگی میں انسان انسان بن کر رہے گا۔ اور ایک ایسی حکومت کی تعمیر ہو گی جس میں ہر شخص کو کام ملے گا جس میں ہر شخص کو رہنے کے لئے اچھی جگہ ملے گی۔ جس میں ایک شخص کو ایک بیوی ملے گی، یہاں نفع خوروں کے لئے کوئی جگہ نہ ہو گی اور جہاں مزدور اور کسان ہونا پاپ نہ ہو گا۔ بلکہ عزت کی نشانی ہو گی۔ اچھا بھائی، مجھے اجازت دو، پریم نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں ٹھیرے ہوئے ہو؟"

"پارٹی کے دفتر میں۔"

"کس وقت وہاں مل سکتے ہو؟"

"میں شام کو وہیں ہوتا ہوں۔"

"اچھا میں تم سے ضرور ملنے آؤں گا۔"

پریم نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور رستوران سے نکل گیا۔

اس رات میں سو نہ سکا۔ رات بھر پریم کا چہرہ مجھے یاد آتا رہا۔ اس کی باتیں مجھے یاد آتی رہیں۔ گو اس کا چہرہ سست ہو گیا تھا۔ گو اس کے بال اڑ چکے تھے اور کافی بدصورت ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی باتیں کتنی خوبصورت تھیں۔ ان میں کتنی سچائی تھی، وہ کتنی ٹھوس تھیں۔ زندگی سے کتنی قریب تھیں، اور اس کی آنکھیں جو اندر دھنس چکی تھیں لیکن ان کی چمک میں برق تھی، بجلی تھی، اُن میں نئے ہندستان کی تعمیر کا اٹل ارادہ تھا۔

صرف تین خط

جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوا ایک موٹی سی بھدی عورت نے اس کے ہاتھ میں لفافہ دیا۔ گرمی کافی تھی اور اس کا جسم پسینے۔۔ سے شرابور تھا۔ اُس نے بُش شرٹ اُتار کر میز پر رکھ دی۔ سامنے کھڑکی سے ہلکی ہلکی ہوا آرہی تھی۔ اُس کا پسینہ سوکھتا گیا اور وہ خط پڑھتا گیا۔ خط پڑھنے کے بعد اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا، نتھنے پھول گئے اور ماتھے پر شکنیں اور گہری ہو گئیں۔ اُس نے خط کو صرف ایک بار پڑھا اور فوراً پیڈ اور قلم نکال کر کچھ لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے دماغ میں بے شمار خیالات آرہے تھے لیکن ان کا سلسلہ کچھ عجیب سا تھا غصہ زیادہ تھا۔ سوچ کم تھی۔ دل و دماغ پر ایک بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر اس نے خط کا جواب نہ دیا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ خط اُس کے چھوٹے بھائی کا تھا،

جو اِن دنوں جالندھر کے ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ اکیلا نہ تھا اس کے ساتھ اس کی بوڑھی ماں۔ اس کا بوڑھا بیمار باپ اور اس کی چھوٹی بہن تھی یہ سب لوگ ایک چھوٹے۔ سے مکان میں رہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ خود بھی جالندھر میں تھا۔ لیکن جب جالندھر میں اُس کے لئے تلاشِ معاش کے دروازے بند ہو گئے تو اس نے سیدھا بمبئی کا رُخ کیا۔ شروع شروع میں وہ مالی لحاظ سے کافی کامیاب رہا اور ہر مہینے گھر والوں کو روپے بھیجتا رہا۔ لیکن اس سال اس کی مالی حالت میں کافی فرق پڑ گیا تھا۔ آمدنی اتنی کم ہوگئی تھی کہ اسے بس دو وقت کا کھانا نصیب ہو سکتا تھا۔ اور کچھ نہیں ——— ان دنوں اُسے روپئے کمانے کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی۔ اس لئے جب کبھی وہ روپئے بھیجنے کے لئے پوسٹ آفس جاتا تو اسے ایک اذیت سی محسوس ہوتی۔ پہلے پہل اسے اس قسم کا کبھی احساس نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ کافی کماتا تھا اور اسے روپئے کی فراہمی میں کافی آسانی تھی لیکن حالات کچھ ایسے بدلے کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ———

آج جب اس کے بھائی کا خط آیا، جس میں اس نے اپنی تکلیفوں اور مشکلوں کا رونا رویا تھا۔ تو بیٹھے بٹھائے اُسے غصہ آگیا، خط میں لکھا تھا "———

اور میں کالج میں پھر داخل ہونا چاہتا ہوں والد صاحب سخت بیمار ہیں اور ساتھ ہی والدہ بھی ——— ان دنوں ہمارے گھر میں بہت سے رشتہ دار آئے ہوئے ہیں بچارے شرنارتھی، مغربی پنجاب کے شرنارتھی۔ ہم کیا کریں۔ ان کا کوئی گھر نہیں رہنے کی جگہ نہیں۔ کوئی روزگار نہیں انھیں گھر سے نکالنا بھی انسانیت نہیں۔ آپ روپے بہت کم بھیجتے ہیں نہ میں پڑھ سکتا ہوں اور نہ گھر کا خرچ ہی ان روپوں میں آسانی

سے پورا ہوتا ہے۔ ہم سب لوگ عجیب کش مکش میں ہیں۔ اتنی بری زندگی ہم نے کبھی نہیں گذاری۔ از راہِ کرم روپے جلدی بھیجئے گا۔ اور زیادہ ——"

اس نے سوچا کہ روپے منگوانے کے علاوہ ان لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آخر وہ اتنے روپے کہاں سے لائے۔ کیا ان لوگوں کو علم نہیں کہ وہ کافی عرصہ سے بیمار ہے۔ کھانسی اور پیچش ہے۔ ہر روز بخار آتا ہے۔ دماغ کا توازن ٹھیک نہیں۔ کبھی اندھیرے سے ڈر لگتا ہے تو کبھی تیز روشنی سے۔ جوڑوں میں درد رہتا ہے دل ڈرتا ہے کہ کہیں گٹھیا نہ ہو جائے۔ وہ اکثر دوستوں، ایکٹروں اور سٹرکوں کے نام بھول جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ اور اسے خیال آتا ہے کہ وہ اندھا ہو جائے گا۔ اس کی بینائی ختم ہو جائے گی اور اس طرح مختلف خیال، مختلف بیماریاں، مختلف ڈر اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر روپیوں کا خیال۔ گھر کا خرچ، اپنا خرچ اور زندگی کی کش مکش، وہ اتنے روپے کہاں سے لائے؟ اتنے روپے وہ لوگ کہاں خرچ کرتے ہیں؟ جالندھر ایک چھوٹا سا شہر ہے بمبئی کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹا۔ اس بمبئی میں بیسیوں جالندھر سما سکتے ہیں اور جالندھر میں اتنی مہنگائی نہیں ہو سکتی۔ چیزیں ضرور سستی ہوں گی۔ سبزیاں سستی ہوں گی۔ مولی۔ گاجر، ساگ، انڈے، گوشت، دال سب کچھ سستا ہو گا —— جالندھر میں کسی کے گھر جانا ہوا تو بھائی پیدل چلے جاؤ۔ نہ بس کی ضرورت نہ ٹرام کی، اس گلی سے نکلے تو دوسری گلی میں آپ کے دوست کا گھر آ گیا۔ لیکن بمبئی کا تو خدا ہی نرالا ہے۔ میلوں کا فاصلہ ہے۔ تو صاحب جالندھر میں آنے جانے کا بھی خرچ بچا اور پھر مکان کا کرایہ کم۔ نوکر کی تنخواہ کم۔ باقی رہے

شرنارتھی ۔ ان کے لئے میں کیا کروں اگر آج تک گورنمنٹ کچھ نہ کر سکی تو رشتہ دار کیا کریں گے ۔ شرنارتھیوں کا خیال ذہن میں آتے ہی اُسے اور غصہ آیا سوچتے سوچتے اُس نے قلم اٹھایا اور بھائی کے خط کا جواب لکھنے لگا ۔

پیارے بھائی ——————

تمھارا خط ملا ۔ مجھے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی (دراصل خط پڑھ کر اسے بہت غصہ آیا تھا ۔ لیکن شروع ہی میں وہ اس غصہ کا اظہار نہ کرنا چاہتا تھا) تم نے اچھا کیا جو بغیر خدشے کے ساری باتیں صاف اور واضح طور پر لکھ دیں تم نے لکھا ہے کہ روپے فوراً بھیجدو ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں پر ہر شخص بیمار ہے ۔ ماں ۔ باپ ۔ بہن ۔ اور دیگر شرنارتھیوں نے اپنا اڈہ جمایا ہوا ہے ۔ شاید تم لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ میں کتنی مشکلوں سے روپے کماتا ہوں ۔ مجھے ان روپیوں کے کمانے میں کتنی ذلت برداشت کرنا پڑتی ہے ۔ شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ میں "کھل سم سم" کا بٹن دباتا ہوں تو روپیوں کا ڈھیر میرے سامنے لگ جاتا ہے —— اگر ایسی بات ہوتی تو خط کے جواب میں —— میں ہمیشہ نوٹ ہی بھیجا کرتا ۔ لیکن میرے بھائی ۔ روپے کمانا کوئی آسان کام نہیں اور خاص کر سرمایہ داری کے دور میں "۔ سرمایہ داری کا نام ذہن میں آتے ہی اسے اور غصہ آگیا ۔ اور وہ سوچنے لگا کتنا بے ہودہ نظام ہے ۔ اور نظام ہی کیوں بے ہودہ ہے خود ہماری سرکار نے ہمارے لئے کیا کیا ہے ۔ اگر ہمارے لئے کچھ نہ کر سکی تو کم از کم ان شرنارتھیوں کے لئے کچھ کرتی ۔ ان لوگوں کو گھر بنا کر دیتی ۔ زمین دیتی تاکہ یہ لوگ کھیتی باڑی کر سکتے ۔ ان کے بچوں کی پڑھائی کے لئے کچھ کرتی ۔ ان لوگوں کا کیا قصور ہے ۔ اِن لوگوں کو

کیوں بے گھر کیا گیا ۔ اس کی سوچ بچار کی قوت سلب ہوتی جا رہی تھی ۔ اور ذہن میں اندھیرا چھایا چلا جا رہا تھا ۔ ایک مبہم قسم کا اندھیرا جس کی کوئی تھاہ نہیں، اس اندھیرے میں لاکھوں شرنارتھی، اُن کے بچے، اِن کے بچے، بائیں بہنیں گڈمڈ ہو کر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ۔ زندگی کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے ۔ اپنا اپنا گھر ڈھونڈ رہے تھے ۔ اکیلے ۔ انجانے اپنے ملک کی محبت کو سینے میں دبائے ہوئے ایک ایسی حکومت کے زیر سایہ جس نے انھیں گھر دیا نہ گھاٹ ۔ نہ اناج نہ نوکری موت، ایک ٹھنڈی یخ بستہ موت ان کا تعاقب کرتی پھرتی ہے ۔ سڑکوں پر اسٹیشنوں پر، گلیوں میں، کیمپوں میں، پلیٹ فارموں پر، ٹمینٹوں میں، کھنڈروں میں، ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں، درختوں کے نیچے ۔ سر چھپاتے ہوئے ۔ اندھیرے میں، اجالے میں ۔ اپنی عزت، محنت اور عصمتوں کا بوجھ اپنے اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ۔ وقت بے وقت ۔ اس جگہ ۔ اُس جگہ ۔ ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے ۔ چپ چاپ خاموش، ساکن ۔ نگاہوں میں انتقام کا جذبہ لیکن پھر بھی خاموش اور اپنے لیڈروں کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ کہ کب انھیں ایک گھر نصیب ہو گا ۔ روٹی نصیب ہو گی اور نوکری ملے گی ... ...

اور وہ سوچتا گیا ——— اور سوچتا گیا ——— اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو بھائی کے خط کا جواب دے رہا تھا ۔ شرنارتھیوں کا مسئلہ اس کے ذہن میں کیسے آ گیا ۔ اس نے قلم کو پھر پکڑا اور خط لکھنا شروع کیا ———"

سرمایہ داری کے نظام کے متعلق میں کچھ لکھنا چاہتا تھا ۔ لیکن جانے دو جب تم کمانے لگو گے تو تمھیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ یہ نظام کتنا

بے ہودہ ہے، اس میں کتنی گندگی ہے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج میں بالکل Normal زندگی بسر کر رہا ہوں۔ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ عیش وعشرت کے لوازمات سے بالکل مبرا ہوں۔ اور باقی رہی یہ بات کہ تم لوگوں کو بھوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہی ان بچارے شرنارتھیوں کی طرف دیکھو حال ہی میں جو Cyclone بمبئی میں آیا تھا۔ اس میں بچارے شرنارتھیوں کے جھونپڑے اڑ گئے۔ ان کا بچا کھچا مال بھی اس طوفان کی نذر ہو گیا۔ کاش کہ گورنمنٹ اس سے پہلے شرنارتھیوں کے لئے گھروں کا انتظام کرتی —— لیکن غریبوں کی کون سنتا ہے، تو میں یہ کہنا چاہتا تھا ہوں کہ ہم لوگوں نے اس قسم کے دن نہیں دیکھے ہمارا گھر ہے، مکان ہے، ایک دو نوکر ہیں، دو وقت کھانا کھاتے ہیں ہم نے فاقے نہیں کئے۔ کپڑوں کے لئے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا۔ اور ہمیں ایسی طوفانی زندگی سے دوچار ہونا پڑا ——

اور ہاں اب کے تم بی اے ضرور پاس کر لو یہ تمھارا آخری سال ہے پر بھائی سیدھی اور صاف بات یہ ہے، پہلے اپنا پیٹ بھرو۔ پھر دوسروں کا۔ اپنے گھر کو سرائے نہ بناؤ۔ اس زمانے میں کوئی کسی کا نہیں۔ جو کچھ ہے وہ تمھارا ہے وہ صرف تمھارا ہے اور کسی کا نہیں ... ... اور دیکھو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھو۔

(۱) جس چیز کی ضرورت ہو، وہی خریدو

(۲) لوگوں کو اپنے گھر میں نہ رکھو۔

(۳) پڑھو۔ اس بار امتحان ضرور پاس کرلو۔

(۴) خود غرض بنو۔

(۵) ہر شخص سے اپنا کام نکالو۔

(۶) جھوٹ بولنے کی عادت ڈالو۔

(۷) مکاری۔ فریب اور دھوکے کو اپناؤ۔

(۸) اپنا پیسہ اپنی جیب میں رکھو۔

(۹) جو شخص ملے اس سے ہنس کر بولو اور جوں ہی وہ پیٹھ موڑے اُسے چار پانچ گالیاں دو۔

(۱۰) اپنی سرکار پر بھروسہ نہ کرو۔ وہ اسی طرح چکمے دیتی رہے گی
مبلغ ایک سو پچاس روپے بھیج رہا ہوں۔ باقی اگلے مہینے میں ——
'تمھارا'

یہ خط لکھ کر اُس نے آرام کا سانس لیا۔ اس کا غصہ اُتر چکا تھا۔ سامنے میز پر چائے کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ اُس نے چائے کا گھونٹ پیا۔ چائے ٹھنڈی تھی۔

'چا ٹھنڈی ہے' وہ چلایا

ایک موٹی سی بھدی سی عورت آئی۔

'لائیے گرم کر دیتی ہوں'

'نوکر دونا، دیکھ کیا رہی ہو'

'خط کس کو لکھ رہے تھے؟'

"دوست کو"

اور یہ جواب سن کر وہ عورت خاموش ہو گئی۔

اُس نے چائے پی۔ خط لفافے میں ڈالا اور پتہ لکھا۔ پتہ لکھنے کے بعد اُسے خیال آیا کہ لفافہ کل پوسٹ کیا جائے۔ اُس نے لفافہ دراز میں رکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرا دن

دوسرا دن پہلے دن سے خوشگوار تھا۔ سامنے دیوار پر چمکتی ہوئی دھوپ تھی۔ آسمان صاف اور نیلا تھا۔ اور اسے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کو اُس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ کھانا لذیذ تھا۔ زبان پر ابھی تک رات کے کھانے کا مزہ تھا۔ کبھی کبھی تو اچھا ملتا ہے کھانا۔ نہیں تو وہی ڈالڈا میں بنی ہوئی بڑیاں دہی دال اور کچی کچی روٹیاں۔ ہوا میں کچھ ٹھنڈک سی تھی۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہ خط کو دوبارہ پڑھے۔ معلوم نہیں کیوں اُسے اِس قسم کا خیال آیا۔ اُس نے دراز سے خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ خط پڑھتا جاتا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آتا جا رہا تھا۔ کیسا روکھا آدمی ہے وہ۔ آج اُس نے اپنی صورت اس خط میں دیکھی۔ وہ کتنا جلد باز قسم کا آدمی ہے۔ وہ بہت جذباتی ہے۔ اسے غصہ جلد آجاتا ہے۔ اِس قسم کے خط لکھنے سے کیا فائدہ۔ بھائی نے روپے مانگے ہیں تو اسے بھیج دو۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید کیا فائدہ۔ دنیا بھر کے شرنارتھیوں کا ذکر۔ اُن کی تکلیفوں اور مشکلوں کا چرچا۔ اپنی اقتصادی حالت کا رونا۔ اور پھر نصیحتیں ہی نصیحتیں اور اسے اپنا زمانہ یاد آیا جب وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اور والد سے روپے منگواتا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس کے باپ کی آمدنی کچھ زیادہ نہ تھی۔ بڑی مشکل سے وہ ۵۰ روپے

ماہوار کماتا تھا۔ لیکن وہ ہر ماہ سو روپے اپنے باپ سے منگواتا تھا۔ یہ روپے اُس کا باپ کس طرح بھیجتا تھا۔ یا تو اس کا باپ رشوت لیتا تھا۔ یا خود نہ کھا کر اپنی خوراک کم کر کے اچھے کپڑے نہ پہن کر اور دیگر اخراجات کم کر کے وہ روپے اُسے بھیجتا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی اُس کے والد نے اپنی ان مشکلات کا ذکر نہ کیا تھا۔ اور پھر اُس کے ذہن میں اُس کے بیمار باپ کی تصویر کھنچ گئی۔ بیمار باپ دس سال سے بیمار دمہ اور کھانسی سے مجبور۔ زندگی سے مجبور اور لاچار۔ آنکھوں کی بینائی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور پھر اس کے بہن اور بھائی اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے کمزور اور نحیف تھے صرف ایک آدمی کی آس پر زندہ ——— اور اس کی ماں، کتنا چاہتی تھی اُسے جب وہ لاہور سے واپس آتا تھا تو اس کے والدین کتنے خوش ہوتے تھے۔ وہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی تھی۔ وہ جو مانگتا تھا مل جاتا تھا۔ اُس نے سائیکل مانگی، اسے سائیکل مل گئی۔ اُس نے گرم سوٹ کے لئے روپے مانگے وہ مل گئے اُس کی جیب خرچ میں اضافہ ہونا چاہیے۔ اس کا جیب خرچ بڑھ گیا۔ کبھی بھی اس کی بات رد نہ کی گئی تھی۔ اور جب وہ دونوں، اُسے ندی کے اُس پار چھوڑنے آتے تھے تو اُسے وداع کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ وہ آنسو جن میں نہ جھوٹ تھا، نہ فریب، نہ کپٹ۔ خلوص، پیار اور ایثار سے بھر کر ہوئے وہ آنسو۔ وہ دیر تک اُسے دیکھتے رہتے حتیٰ کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ لیکن ان کے آنسو اس کی نگاہوں کے سامنے جگمگاتے رہتے۔ وہ آج بھی ان آنسوؤں کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

وہ دن کتنے خوبصورت تھے۔ وہ راتیں کتنی خوابناک اور حسین تھیں۔

وہ دن جب اُس کا والد کماتا تھا اور وہ کھاتا تھا۔ وہ پھیلی ہوئی وادی۔ وہ جنگل اور پہاڑ۔ جھومتے ہوئے درخت اور تر و تازہ پھل۔ انار، سیب، ناشپاتی، آڑو، خوبانی، ہاڑی، داکھ، آلوچے۔ اور اس کے ذہن میں مختلف قسم کے پھلوں کے نام تیرنے لگے۔ اور اس کے منہ میں پانی آگیا۔ پرانی یادوں نے اس کے دل کو موم کر دیا۔ وہ سختی جو آہنی خول بن کر اُس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی غائب ہوگئی اس کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اُس نے سوچا کہ خط کا لہجہ بہت سخت ہے، کھردرا ہے لفظوں میں روکھا پن ہے۔ انداز بیان میں نرمی کی کمی ہے۔ سوچ کم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تلخیوں نے اس کی زندگی میں ایک زہر سا بھر دیا ہے۔ وہ اس زہر کو بانٹنا چاہتا ہے۔ اس ڈر کے مارے کہ اس زہر سے کہیں اس کی زندگی سڑ گل نہ جائے۔ جبھی تو وہ اس زہر کی نالی کا منہ دوسری طرف موڑ رہا ہے۔ جب اس کا باپ یہ خط پڑھے گا تو کیا سمجھے گا۔ وہ کھاتا رہا اور کماتا رہا اور کماتا رہا حتیٰ کہ زندگی اپنی تمام تر بہاریں، اپنا تمام سونا، اپنی تمام چاندی، اپنی تمام لطافتیں لئے ہوئے اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ اور اس کی زندگی میں ایک نہ ختم ہونے والا اندھیرا چھوڑ گئی۔ وہ اندھیرا جس میں وہ کھانستا تھا۔ وہ اندھیرا جس میں اُس پر دمے کے شدید حملے ہوتے تھے ——— اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

نہیں نہیں، وہ خط کو پوسٹ نہیں کرے گا۔ وہ بالکل ایک سیدھا سادا خط لکھے گا۔ نہایت صاف اور واضح۔ اس نے جلدی سے لفافہ اٹھایا اور خط کو پرزے پرزے کر ڈالا۔ خط پھاڑ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی اس کی موت

کی سزا منسوخ ہوئی ہو۔ وہ بہت خوش تھا اپنے آپ سے۔ اُس نے پیڈ نکالا اور دوسرا خط لکھنے لگا۔

پیارے بھائی

(پہلے خط کے لفظوں کی گونج اس کے ذہن میں باقی تھی، بڑی جد و جہد کے بعد اُس نے نئی راہ نکالی)

تم کالج میں داخل ہونا چاہتے ہو اس لئے میں ڈیڑھ سو روپے بھیج رہا ہوں دراصل میں یہ چاہتا ہوں، بلکہ ہر طرح سے کوشش کرتا ہوں کہ تمھیں وقت پر روپے ملتے رہیں لیکن اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ یہاں کے حالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں یعنی ناسازگار قسم کے (لفظ ناسازگار کچھ تلخ ہے اُس نے سوچا۔ خیر کوئی بات نہیں پہلی خط لکھ لوں پھر تلخ الفاظ کاٹ دونگا) بیکاری، بیماری اور مہنگائی بڑھتی جا رہی ہو اس لئے میرا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہتا۔ آمدنی کے راستے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ یعنی پہلے سے میری آمدنی بہت کم ہے (اُس نے سوچا آمدنی کے متعلق لکھنے سے کیا فائدہ۔ بیچارے فکر کریں گے۔ اگر میری آمدنی کم ہو رہی ہے تو وہ کیا کریں؟ — کم از کم انھیں معلوم تو ہو جائے شاید وہ اِسی اشارے سے اپنا خرچ کم کر لیں) اُس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم ذرا احتیاط سے کام لینا (اُسے احتیاط کا لفظ بہت پسند آیا یہ خاص اس کے اپنے دماغ کی اختراع تھی۔ اس لفظ سے وہ تمام باتیں سمجھ جائیں گے۔ یعنی کہ، اُس نے سوچا، وہ کم خرچ کریں گے۔ بس میرا مطلب بھی یہی ہے۔ اور لفظ احتیاط لکھ کر اُس نے اپنی پیٹھ ٹھونکی)

میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو بہت ہی کم روپے بھیج رہا ہوں۔ لیکن کیا

کروں حالات درست ہونے میں نہیں آتے۔ بہر حال والد صاحب کی صحت کا خیال رکھنا۔ اور اب کے نم فیل نہ ہونا ————

میں آج کل بہت کم کھاتا ہوں۔ بڑی مشکلوں اور تکلیفوں سے دن کاٹ رہا ہوں۔ پچھلے دنوں میں کھانسی اور پیچش سے بیمار تھا۔ اب میری صحت پہلے سے بہتر ہے ———— اور ہاں ایک بات لکھنا بھول گیا ———— معلوم ہوا ہے کہ آج کل تمھارے یہاں ضرورت سے زیادہ مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں ———— بھائی اتنے مہمانوں کو اپنے پاس ٹھہرانے سے کیا فائدہ ————

یہ خط لکھ کر اس کی ڈھارس بندھی۔ اب تو خط کا لب و لہجہ بالکل ٹھیک تھا کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے گھر والوں کو دکھ ہو۔ اُس نے کاغذ کو دوہرا کر کے لفافے میں ڈالا۔ پتہ لکھا اور باہر جانے کے لئے تیار ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"خط پوسٹ کرنے"

"آج اتوار ہے۔ پوسٹ آفس بند ہے"

"اوہ"

تیسرا دن

آج وہ دیر سے جاگا۔ رات کو اس کے دوست نے اسے شراب پلا دی تھی۔ بڑی مدت کے بعد اُس نے شراب پی تھی۔ صرف تین پیگ۔ فرانس کی بہترین شراب تھی۔ اس کے بعد اس کے دوست نے اُسے ایک اچھے ریسٹوران میں کھانا

کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس کے ذہن کی بہت سی اُلجھنیں دور ہوگئیں اور ذہن صاف ستھرا ہوگیا۔ بہت سی کثافت دھل گئی۔ اور صبح اُٹھ کر جب اُس نے دیوار پر چمکتی ہوئی دھوپ کو دیکھا تو اُس کے من کی اداسی اور کئی مہینوں کی یاسیت ماند پڑ چکی تھی۔ سامنے ٹین کے چھپرے پر دو کبوتر آنکھ مچولی کر رہے تھے۔ ہوا کچھ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی سی تھی۔ آنکھوں میں اب تک فرانسیسی شراب کا خمار تھا اور گذری ہوئی رات کی دلآویز خوشی اس کی آنکھوں میں تھرک رہی تھی۔

معاً اُسے پھر خط کا خیال آیا۔ اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔

اس نے لفافہ کھولا اور خط کو پڑھا۔ دراصل اُسے اپنی بیماری کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور پھر ساتھ ہی اس نے بیکاری اور قلیل آمدنی کا ذکر کیوں کیا۔ اور احتیاط کا لفظ اس نے استعمال کیا ہے وہ تو نہایت ہی غیر موزوں ہے۔ اس نے سوچا

اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اِن ڈیڑھ سو روپوں سے کوئی کیا فضول خرچی کر سکے گا؟ کوئی مہمان گھر میں آجائے تو انسان کیا کرے۔ یہاں بھی لوگ آتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں۔ کبھی کبھی کھانا کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

دراصل اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہیں لکھنا چاہیے۔ اس نے دوسرا لفافہ بھی پھاڑ ڈالا۔ اور ایک اور کاغذ نکالا اور لکھا۔

پیارے بھائی!

تمہارا خط ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مبلغ ڈیڑھ سو روپے بھیج رہا ہوں۔ جب مل جائیں تو اطلاع دینا،

تمہارا ——

خط لکھ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا ۔ ایک انگڑائی لی اور پھر گرم بستر پر لیٹ گیا ۔ دھوپ اور تیز ہو گئی تھی ۔ کمرے میں پہلے سے زیادہ روشنی تھی ۔ ہوا میں ایک تازگی اور شگفتگی تھی ۔ اس کی زندگی میں وقتی طور پر ایک سکون سا آگیا تھا ۔ جیسے طوفان نے اپنا راستہ بدل لیا ہو ــــــــ اس نے سوچا وہ خط لکھ کر کیا کرے گا ۔ وہ روپے تار کے ذریعہ بھیج رہا ہے ۔ رسید تو آ ہی جائے گی ۔ اس نے تیسرے خط کو بھی پرزہ پرزہ کر دیا ۔ اور پھر اپنی اس حرکت پر مسکرایا ۔ یہ عجیب سی حرکت تھی ــــــــ اس نے سوچا ــــــــ سامنے صوفے پر ایک موٹی سی بھدی سی عورت سوئی پڑی تھی ۔ اور وہ ایک عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا ۔ اس کی نگاہ پلنگ کے ایک گوشے کی طرف گئی جس کے قریب تین خطوں کے پرزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ــــــــ

دماغ خراب ہوگیا ہے

"میں کہتا ہوں۔ تمہاری بہن کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" باپ نے اپنے جوان بیٹے کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"سو بار چلا چکی ہوں، کہ جوان بیٹی کو گھر میں نہ بٹھائے رکھو۔ میری بات مانتا ہی کوئی نہیں۔" قریب ہی چارپائی پر لڑکی کی ماں نے رضائی اوڑھے ہوئے کہا۔

"تم نے کچھ دیکھا آج"، باپ نے بیٹے کے قریب جاکر کہا۔

"آج تمھاری بہن کچھ لکھ رہی تھی" ماں نے کراہتے ہوئے کہا
"کیا کہا ——— لکھ رہی تھی ——— کیا لکھ رہی تھی" بھائی کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔

"مجھے کیا معلوم۔ کیا لکھ رہی تھی ——— جو کچھ وہ لکھتی ہے، مجھے کب دکھاتی ہے۔ جب میٹرک کا امتحان دینے گئی تھی۔ تو میں نے کہا تھا۔ چھوڑ دو۔ اس میٹرک ویٹرک کو۔ گھر کا کاج سکھاؤ بہن کو۔ اس وقت سب نے میرا منہ بند کر دیا۔ اب دیکھ لو۔ پڑھ لکھ کر یہ لڑکیاں کیا گل کھلا رہی ہیں۔ میٹرک پاس کرانے سے یہ بہتر تھا کہ اس کی شادی کر دی جاتی۔ تمھیں اپنی بہن کی پرواہ ہی نہیں، تمھیں تو اپنی شادی کی فکر تھی"

"میری شادی کو آج چھ سال ہو چکے۔ اُن دنوں لپشپا دس سال کی تھی"۔ بھائی نے مجرمانہ انداز سے کہا

"اب تو سولہ سال کی ہے، اور پھر طرہ یہ کہ آج کچھ لکھ رہی تھی"

"کہاں گئی لپشپا"۔ بھائی نے کڑک کر پوچھا

"یہیں کہیں ہو گی" ماں لاپروائی سے کہنے لگی: "گھر کا ایک دروازہ ہو تو بند بھی کر دوں۔ اُسے قفل لگاؤں۔ اس گھر کے چھ دروازے ہیں۔ اگر دروازے بند کروں، تو کھڑکیاں کھلی رہتی ہیں۔ اور اگر کھڑکیاں بند کروں تو سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ باہر چقیں لگا دوں۔ کھڑکیوں پر پردے اور دروازوں پر قفل"۔

خاوند نے بیوی کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔ اسے آج محسوس

ہوا۔ اور وہ ۲۰ سالہ ازدواجی زندگی گذارنے کے بعد، کہ اس کی بیوی واقعی ذہین ہے۔ کتنا سہل علاج ہے، لیشیا کو سدھارنے کا۔

"اُسے کیا حق ہے۔ کہ وہ اس قسم کی باتیں سوچے یا لکھے"

"کون سی باتیں"

"تم دن بھر دفتر میں رہتے ہو، تمھیں کیا بتاؤں۔ وہ کیا لکھتی ہے، آج اس نے ایک کہانی لکھی ہے"

"کہانی"۔ بھائی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ــــــ "کہانی لکھنا کوئی جرم تو نہیں" بھائی نے اپنی ذہانت اور ذکاوت کا رعب والدین پر جمانا چاہا۔ اور ساتھ ہی یہ فقرہ کہہ کر اُس نے رجعت پسندی کے پرخچے اڑا دیئے"

"تم نے سنی ہے۔ اس کی کہانی"

"مجھ سے کوئی بات بھی کرے"

"تم سنو بھی اس کی بات"

"تمھاری بہن نے لکھا ہے"۔ باپ یہ لفظ کہتے کہتے رک گیا۔

"یعنی آپ کی لڑکی نے" بھائی بولا

"ہاں تمھاری بہن نے، مجھے شرم آتی ہے۔ وہ قصہ سناتے ہوئے" باپ نے کندھوں پر کمبل اوڑھ لیا۔

"شرم کس بات کی ہے۔ آپ صاف صاف کہہ دیجئے۔ آخر لڑکی تو آپ کی ہے نا"۔ ماں نے سرہانے کو دباتے ہوئے کہا

"جیسے تمھاری نہیں" باپ نے کڑک کر کہا۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں پتا جی"۔

"اچھا تو سنو، کان کھول کر سنو۔ تمھاری بہن نے لکھا ہے، کہ اسے محبت ہے ایک لڑکے سے"۔

"محبت"، بھائی نے چونک کر کہا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اور پھر سنبھل کر کہنے لگا۔ "لیکن یہ تو کہانی میں لکھا ہو گا اُس نے"۔

"سنو تو سہی۔ پہلے ساری کہانی سن لو۔ پھر تنقید کرنا۔ پھر لکھتی ہے کہ والدین لڑکی کو لڑکے سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتے"۔

"پھر"

"والدین لڑکی کی شادی کسی اور لڑکے سے کر دیتے ہیں، یہ لڑکا والدین نے خود پسند کیا ہے"۔

"ٹھیک کیا والدین نے، بھائی نے سر کو جھٹک کر کہا

"شادی کے بعد لڑکی کی اپنے خاوند سے نہیں بنتی"۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے"۔

"اپنی بہن سے پوچھو"

"خیر، سنا بیئے، پھر کیا ہوتا ہے"۔

"ایک شام، جب وہ اور بیوی اکٹھے سیر کرنے جا رہے تھے، کہ راستے میں لڑکی کو اپنا عاشق مل گیا۔ لڑکی اپنے عاشق کو دیکھ کر رک جاتی ہے"

"کیا کہا۔ رک جاتی ہے"۔

"جی ہاں"۔

عاشق کو دیکھ کر لڑکی بے ہوش ہو جاتی ہے۔ عاشق اپنی محبوبہ کو اپنے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔ اور اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے خود شرم آتی ہے، یہ کہتے ہوئے۔

"کہئے تو سہی"، بھائی نے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا۔

"عاشق اپنی محبوبہ کا منہ چوم لیتا ہے"، باپ نے یہ کہہ کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس وقت تینوں کو ایسا محسوس ہوا۔ کہ مکان کی چھت ان پر گر پڑی ہے اور پتھروں کے بوجھ سے اُن کے سر اوپر اٹھ نہیں سکتے، بھائی چونکہ جوان تھا، اور اس نے ہمت اور شجاعت کے ساتھ سر بلند کیا۔ اور نہایت ہی دہشت لہجے میں کہنے لگا "یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ایسے فحش خیالات پشپا کے دماغ میں کس طرح آ گئے۔ میرے پرماتما۔ اب کیا ہو گا —— اب کیا ہو گا"۔ بھائی کی ٹانگیں غصہ سے تھرتھرانے لگیں "لڑکی کو کیا حق ہے کہ وہ عشق و محبت کے افسانے لکھے۔ اُس کی عمر ہی کیا ہے۔ اگر وہ واقعی کچھ لکھنا چاہتی ہے۔ تو دھارمک افسانے لکھے۔ رامائن اور مہابھارت پڑھے، ویرا بھیلنو، راماتند۔ شاما نند۔ سدانند۔ اِٹھانند۔ دسانند

——"

کیا بکواس کر رہے ہو۔

"میں بکواس کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں، کہ آپ کی لڑکی دھارمک افسانے کیوں نہیں لکھتی"،

ماں نے رضائی کو ٹانگوں کے نیچے رکھتے ہوئے کہا "مجھے

پشپا کی ہر حرکت بُری لگتی ہے، ایک پل بھر بھی گھر میں نہیں ٹھہرتی۔ اگر اس دروازے کو بند کر دوں، تو دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے، باہر جانے کے سو بہانے بناتی ہے۔ کبھی کھڑکی میں کھڑی ہو کر مسکرانے لگتی ہے۔ کبھی یونہی مسکراتے مسکراتے ہنسنے لگتی ہے۔ اپنا سر ڈھانپ کر نہیں رکھتی۔ سینے پر پلو ٹھہرتا ہی نہیں، ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔

"اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے" باپ نے رعب سے کہا۔ جیسے پریوی کونسل کا آخری فیصلہ اُن کے منہ سے ادا ہونا تھا۔

"کہاں گئی وہ مردود۔ کدھر ہے۔ پشپا ——— میں اُسے کبھی یہ باتیں سوچنے نہ دوں گا۔ ماں اُس دروازے پر قفل لگا دو ——— یہ چقیں گرا دو۔ کھڑکیوں پر پردے لگا دو" اور اس کے دماغ کو دھارمک خیالات سے جامد کر دو۔ وہ نہیں سوچ سکتی، وہ کبھی ایسے خیالات اپنے دماغ میں نہیں لا سکتی۔ میں اس کے دماغ کے ہر کونے میں سیمنٹ بھر دوں گا۔ ایک ایک شگاف میں سیسہ بھر دوں گا۔ وہ سوچتی ہے۔ میری بہن ہو کر وہ مسکراتی ہے اُسے کیا حق ہے، کہ وہ اس عمر میں مسکرائے ——— وہ ہنستی ہے۔ اُسے کیا حق ہے، کہ وہ اس عمر میں ہنسے"

"اور اُس لونڈے کو جانتے ہو"

"کون سا لونڈا"

وہی آوارہ سا۔ جس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے ہیں، مجھے نفرت ہے اُس سے۔ ماتا ——— وہ ہمارے گھر کبھی کبھی آتا ہے۔ جب

کبھی وہ آتا ہے۔ تمہاری بہن اس کی طرف بار بار دیکھتی ہے، اس نے اس سے پانی مانگا۔ تو فوراً پشپا پانی لے آئی۔ کس نے کہا تھا پانی لانے کے لئے اس کی ماں پانی دے سکتی تھی۔ تم سمجھ گئے نا ـــــ ایک بار وہ میری مزاج پرسی کرنے آیا۔ کیا ضرورت تھی پشپا کو اندر آنے کی۔ لیکن وہ فوراً اندر آ گئی اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ اور پھر مسکرانے لگی۔ سر پر سے پلو کھسک گیا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کی حقیر ـــــ ذلیل مسکراہٹ کو وہیں سے نوچ لوں ـــــ بے حیا کہیں کی۔ نہ اپنی عزت کا پاس۔ نہ والدین کی عزت کا خیال۔

"کہاں گئی پشپا"۔ بھائی نے کڑک کر پوچھا۔ آج آئے تو سہی۔ میں پوچھتا ہوں"

اتنے میں پشپا آ گئی۔

کیا بات ہے بھیا" قہر آلود نگاہوں لڑکی کے چہرے پر گڑ گئیں بات۔ تم اس کمرے میں آؤ" بھائی کی آنکھیں غصے سے انگارہ ہو گئیں۔

"سر ڈھانپ لو" لڑکی نے سر ڈھانپ لیا۔

"سینے پر دوپٹہ رکھو" لڑکی نے سینہ ڈھانپ لیا

"مسکراؤ مت" لڑکی کے لب جامد ہو گئے۔

میری طرف دیکھو۔ لڑکی اپنے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"تیری آنکھوں میں چمک کیوں ہے"۔ بھائی نے پوچھا
"چمک" لڑکی نے گھبرا کر کہا
"ہاں، ہاں، چمک۔ میں کہتا ہوں یہ چمک کہاں سے آگئی۔ یہ مسکراہٹ جو تمھارے لبوں پر ناچ رہی ہے، یہ کہاں سے آگئی۔
"میرے لب تو جامد ہیں بھیا" آواز میں انکسار تھا۔
"تمھارا دماغ تو جامد نہیں، وہ سوچتا ہے۔ وہ بار بار سوچتا ہے، اور کیوں سوچتا ہے۔"
"دماغ بنا ہی ہے سوچنے کے لئے بھیا" لڑکی نے ڈرتے ڈرتے یہ الفاظ کہے۔
"میں تمھیں سوچنے نہ دوں گا۔ میں کبھی نہ سوچنے دوں گا۔ پھر محبت اور عشق کے افسانے"
"مجھے آج تمھاری شرارتوں کا علم ہوا ہے۔ ہر شخص تم سے تنگ سا ہے، نالاں ہے۔ تم ——— تم دھارمک افسانے کیوں نہیں لکھتیں، میں تو افسانے لکھنے کے بالکل خلاف ہوں۔ چونکہ پڑھا لکھا ہوں۔ اس لئے شاید تمھیں دھارمک افسانے لکھنے کی اجازت دے دوں۔ رامائن مہا بھارت۔ ویرابھیمنو۔ حقیقت رائے۔ ہمارا تمام ادب اچھے افسانوں سے بھرا پڑا ہے"
"مجھے دھارمک افسانے اچھے نہیں لگتے بھیا"
"تمھیں کیا اچھا لگتا ہے"

"بھیا!" آواز میں پیار تھا۔
"میں کہتا ہوں۔ تمھیں کیا اچھا لگتا ہے" بھائی کی آواز میں کڑک تھی
"یہ شفاف نیلا آسمان" لڑکی نے رک رک کر کہا
"شفاف نیلا آسمان" بھائی نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا۔
"یہ چمکتی ہوئی دھوپ"
"چمکتی ہوئی دھوپ" بھائی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"یہ سبز نیلے پتے —— شفق کی لالی —— چاند کی سیمیں کرنیں
املی کے درختوں کے پیچھے ابھرتا ہوا چاند —— کنول کے پھول"
یہ چیزیں بری نہیں ۔ بھائی کے دماغ کے جالدار پردوں سے یہ
آواز ٹکرائی ۔ وہ خود ان چیزوں کو پسند کرتا ہے ۔ بھائی نے سوچا۔
اور اسی دوران میں ایک نرم سی آواز اس کے کانوں میں بھنبھنانے
لگی ——

"بھیا —— میں اتنی بری نہیں —— جتنا کہ تم مجھے سمجھتے ہو۔
صرف مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ صرف مجھے —— مجھے برے بھلے
کی کافی تمیز ہے۔ میں اتنی انجان نہیں۔ تم دروازوں پر قفل لگا سکتے ہو۔ کھڑکیوں
پر پردے ڈال سکتے ہو۔ برامدے میں چقیں لگا سکتے ہو۔ لیکن دماغ پر کون
سا سیمنٹ لگاؤ گے۔ دماغ میں کس طرح لوہا بھروگے ۔ یہ سوچتا ہے۔ یہ
ہر روز سوچتا ہے۔ اور یہ باتیں کس نے نہیں سوچیں۔ تم نے بھی سوچی ہونگی
دنیا کا ہر انسان ایسی باتیں سوچتا ہے —— اور لڑکی کی آواز بھرا گئی ۔

بھائی نے بہن کی طرف دیکھا۔ بہن کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو لرزنے لگے۔

شاید اس کی بہن درست کہتی ہے۔ وہ بہن ہونے کے علاوہ ایک عورت بھی ہے ——— شاید ——— اور اس نے نوکر کو آواز دی۔ اور کہا یہ دروازے کھول دو، یہ پردے اٹھا دو، یہ چقیں پھینک دو۔ آج ——— اسی وقت ——— ابھی ——— اور ٹھنڈی تازہ۔ پاک ہوا کو اندر آنے دو۔

دونوں مسکرانے لگے۔ ان کی مسکراہٹ قہقہوں میں مبدل ہو گئی ساتھ والے کمرے سے آواز آ رہی تھی۔

"دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں

اس وقت چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ناریل کے درخت
بھی اس اندھیرے میں دکھائی نہیں دیتے۔ میرا لحاف اوس کی وجہ سے
بھیگ چکا ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں، لیکن نیند نہیں آتی، یہ کمبخت نیند بھی
عجب چیز ہے، کبھی آتی ہے، اور کبھی نہیں آتی۔ اکثر میں ذہنی طور پر میں پریشان
رہتا ہوں، اپنے متعلق سوچتا ہوں، مستقبل کے متعلق خیال آرائیاں کرتا ہوں
ماضی کے دھندلکے میں ناامیدی کے سائے تیرتے نظر آتے ہیں، اور حال

ایک بے کیف، بے جان سا نقطہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اس دھند لکے میں ایک تم ہی ہو، جو ایک روشنی کے مینار کی طرح درخشاں نظر آتے ہو، اور پھر میں تمھارے متعلق سوچتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم سے باتیں کروں، لیکن جب کبھی تم میرے سامنے آتے ہو، تو میں خاموش ہو جاتا ہوں ہیں اپنے دل کا حال تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن کہہ نہیں سکتا۔ میں تمھارے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، لیکن زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ تمھیں معلوم ہے۔

———— اِس وقت تم مجھ سے کافی دور ہو۔ صرف تمھاری نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں، جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہیں، کہ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو مجھے اچھی طرح معلوم ہے ———— اور کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ واقعی تم اُن باتوں سے اچھی طرح واقف ہو ———— لیکن ہو سکتا ہے، کہ تم جان بوجھ کر اُن باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ میں تمھاری عزت کرتا ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ———— خیر اس بات کو جانے دو۔ میں اس دنیا میں اور آدمیوں کی بھی عزت کرتا ہوں۔ نام گنوانے سے کیا فائدہ۔ اور اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ عزت کے علاوہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور تم ہنسو گے پڑھ کر کتنا عامیانہ جذبہ ہے، محبت کے جذبے کا اظہار خود ایک کمینہ فعل ہے۔ اس جذبے کو کافی عرصے سے دل میں جگہ دے چکا ہوں، اس کی کیا ضرورت تھی، اگر ضرورت نہ ہوتی تو میں اس کا اظہار نہ کرتا ———— تم مسکرا رہے ہو،

شاید تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔ کہ میں کتنی عامیانہ باتیں کرتا ہوں۔ زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں۔ جب ہر آدمی عامیانہ باتیں کرتا ہے۔

______ کیا میں سگرٹ سلگا سکتا ہوں، جب میں سگرٹ پیتا ہوں، تو ذہن میں ایک عجیب تھرتھراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ دھواں آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہوتا ہے۔ اور رات کے اندھیرے میں گم ہوتا جاتا ہے اُداس آہستہ آہستہ گر رہی ہے۔ ٹھنڈی یخ بستہ اوس، رات کے آنسو کتنے ٹھنڈے ہوتے ہیں، کتنے پاک اور صاف، اور میں چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق سوچتا ہوں کہ مجھے اِن چھوٹی چھوٹی باتوں سے بے پناہ محبت ہے، یہی کہ میں تم سے کیوں محبت کرتا ہوں، میں تمھاری عزت کرتا ہوں۔ میں تمھاری عزت کیوں کرتا ہوں، ایک عام انسان کے لئے یہ جواب کافی ہے، کہ تم مجھ سے بڑے ہو، میرے بڑے بھائی ہو۔ اور کافی روپے کماتے ہو،

______ اور چونکہ میں ایک عام آدمی ہوں، ایک بڑا انسان نہیں، مشہور نہیں، جیب روپوں سے ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ ہر لحہ کسی نہ کسی کا دست نگر رہتا ہوں ______ اور اکثر تم سے ہی روپے لیتا ہوں۔ تو ان حالات میں اور کیا کر سکتا ہوں، میں اُس شخص کی عزت کروں، اُس سے محبت کا اظہار کروں، اور اس جذبے کو اس نفاست سے بیان کروں کہ اس شخص کو میری سچائی اور محبت پر پورا پورا بھروسہ ہو جائے، میں نے اکثر یہ چاہا ہے، کہ تم سے کہدوں۔ کہ مجھے تم سے اُنس ہے، پیار ہے، لیکن ہر بار میں نے اپنے آپ کو روکا۔ اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ محبت کا اظہار تو ہر شخص کر سکتا ہے

اور کرتا ہے۔ لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں، یہ دراصل انسان کی فطری کمزوری ہے، ہر انسان اپنی کمزوری سے دوسرے شخص کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اس بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں کہ یہ جذبہ میرے دل میں کیوں موجزن ہے۔ زندگی میں میں نے آج تک کسی شخص سے محبت نہیں کی۔ میں محبت کے معاملے میں بہت سنگ دل ہوں میں نے آج تک کسی عورت کو پیار بھرا خط نہیں لکھا۔ کسی عورت سے اظہار عشق نہیں کیا، اور یہ سچ ہے کہ مجھے اپنی ماں سے اتنی محبت نہیں اپنے باپ سے اتنا پیار نہیں، اپنے چھوٹے بھائی اور بہن سے اتنا اُنس نہیں، جتنا تم سے ہے۔ اگر حالات کا جائزہ لیا جائے۔ تو ایک بات صاف نظر آئے گی۔ کہ میں تمھیں اس لئے چاہتا ہوں کہ تم ایک بڑے آدمی ہو۔ شہرت، عزت اور روپیہ تمھارے پاس ہے —— کہ واقعی تمھاری اسی لئے عزت کرتا ہوں، کون کہہ سکتا ہے۔ شاید یہی بات ہو۔ لیکن پھر سوچتا ہوں، کہ یہی بات ہوتی تو معاملہ صاف تھا۔ یہ دماغی کش مکش کیوں ہے اور یہ الجھن کس لئے —— یہ خیال مجھے کیوں بار بار ستاتا ہے، پریشان کرتا ہے، میری نیند حرام کرتا ہے۔ پھر خیال آتا ہے، یہ بات نہیں۔ اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تو ایک خیال بجلی کی طرح دوڑتا ہے، اور مجھے فوراً یاد آجاتا ہے، کہ تمھارا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا ہے، شاید اسی وجہ سے تمھاری عزت کرتا ہوں شاید اسی وجہ سے تم سے محبت کرتا ہوں۔

وقت آہستہ آہستہ گذر رہا ہے۔ رات کے ٹھنڈے آنسو نیند سے چُور ہو کر اِدھر اُدھر گر رہے ہیں۔ میرے ساتھی خراٹے لے رہے ہیں۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے ہیں۔ ہوا ناریل کے پتوں سے ہم آغوش ہوتے ہوئے گذر رہی ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ رات خاموش ہے، ناریل کے درخت اس خاموشی میں چپ چاپ کھڑے ہیں۔ زندگی مصیبتوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے ——— اور مجھے خیال آتا ہے کہ میرے ماں باپ کا سلوک مجھ سے بُرا نہ تھا، اُن سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے کیا، مجھے اپنے باپ کے خلاف کوئی شکایت نہیں، کوئی شکوہ نہیں، وہ صحیح معنوں میں انسان ہے، لیکن اُن کے لئے میرے دل میں محبت کا جذبہ اتنی شدت سے نہیں، جتنا تمھارے لئے ہے۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، محبت کے جذبے کے اظہار کو میں ایک کمینہ فعل سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں میرے پاس ہے بھی کیا، میں روپے سے لوگوں کو مرعوب نہیں کر سکتا، ذہانت سے اپنا سکہ نہیں بٹھا سکتا، صرف احساس رہ گیا ہے، احساس کے چند لمحے، چند یادیں ——— اور اگر میں اس احساس کو بھی نظر انداز کر دوں، تو میری زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو جائے، کہ جینا دوبھر ہو جائے۔

میں جانتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں، کمزوریاں ہیں، مگر خامیاں کس میں نہیں ہوتیں، میں تمھاری کمزوریوں کو جانتا

ہوں، خامیوں سے اچھی طرح واقف ہوں ــــــ میں آج ایک شکایت
لے کر آیا ہوں، شاید اس شکایت سے تمھیں دکھ پہنچے، لیکن کیا کروں،
تمھارے رویے سے مجھے دکھ پہنچتا ہے، مجھے اذیت ہوتی ہے
ــــــ میں جانتا ہوں کہ میرے رویے سے تمھیں دکھ پہنچا ہوگا۔
میری زندگی شکستوں کی المناک داستان ہے، زندگی ایک سیدھی
سادی لکیر نہیں اس میں بہت سے پیچ و خم ہیں، دشوار راستے ہیں،
سنگلاخ چٹانیں ہیں، اور میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں لیکن ڈر جاتا ہوں
اور پیچھے ہٹ جاتا ہوں، تم نے مجھے کئی بار کوسا ہوگا، لیکن اپنے دل
میں۔ تم نے میری شکستوں کے متعلق کبھی کچھ نہ کہا، ہمیشہ میری
شکست کو اپنی شکست سمجھا ــــــ کاش تم نے مجھے ایک بار جھڑکا
ہوتا، مجھے ذلیل کیا ہوتا، گالیاں دی ہوتیں، جیسا کہ ہر باپ اپنے بیٹے
کو دیتا ہے، جیسے کہ ہر بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کو گالیاں دینے
کا حق رکھتا ہے ــــــ لیکن تم نے کبھی بھی اس قسم کی حرکت نہیں
کی ــــــ کاش تم نے کی ہوتی تو شاید میں اپنا بوجھ ہلکا کر سکتا، اور
بتا سکتا کہ جب تم گر سکتے ہو تو میں اُٹھ سکتا ہوں ــــــ لیکن ایسا
کبھی نہ ہوا۔ اور تم میری نظروں میں اُسی طرح رہے جس طرح پہلے
تھے۔ ہاں اس چھوٹی سی زندگی میں ایک دو بار ایسے موقعے آئے جب
تم نے مجھ سے کچھ امید کی ہو ــــــ لیکن اُن موقعوں پر میں نے ہی
شکست کھائی ــــــ ہاں وہ دن مجھے یاد ہے، دسمبر کی صبح

تھی، ہوا ٹھنڈی اور تیج بستہ تھی، ڈاکیہ تمھارا خط لایا، جس میں لکھا تھا کہ تم تانگے سے گر پڑے ہو اور سخت زخمی ہوئے ہو۔ اس خط کا صاف مطلب تھا کہ کوئی نہ کوئی تمھارے پاس آجائے تو اچھا ہے۔ اور گھر میں سے میرے سوا اور کون آسکتا تھا لیکن میں نہ گیا۔ شاید روپوں کی کمی کی وجہ سے تمھارے پاس نہ پہنچ سکا۔ اور جب تم تندرست ہو گئے تو میں تمھارے پاس پہنچا۔ اور تمھاری باتوں سے یہ عیاں ہو گیا کہ تم کو اس بات کا شدید رنج تھا۔ مصیبت کے وقت کوئی بھی نہ پہنچ سکا ـــــــ اور اسی طرح کئی اور موقعے بھی آئے ہوں گے جب میرے روپے نے تمھیں ناامید کیا ہو، ضرور کیا ہو گا۔ اکثر میری مالی حالت کمزور رہتی ہے، آج پیسے کما تا ہوں تو کل بے کار۔ اور تم یہ ہمیشہ چاہتے رہے کہ میں کسی اچھے سے عہدے پر فائز ہو جاؤں لیکن بدقسمتی سے میں ہمیشہ بے کار رہا۔ اور تمھیں اس بات کا گلہ رہا لیکن تم نے مجھ سے شکایت نہ کی، صرف ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا۔ ہم دونوں سڑک پر اکٹھے جا رہے تھے، کیا تم اس شخص سے ملے تھے؟

نہیں ـــــــ میں نے جواب دیا

کیوں؟

میں لوگوں کی خوشامد نہیں کر سکتا۔ مجھے چاپلوسی سے نفرت ہے

اور تم میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے ـــــــ چند لمحے گذر گئے

اور تم نے میری طرف دیکھ کر کہا، خیر، کوئی بات نہیں، تم کسی کی خوشامد نہ

کرو۔ اب تمھارے لئے مجھی کو خوشامد کرنی پڑے گی،

یہ الفاظ سن کر میں شرمندہ ہو گیا۔ وہ فقرہ اب تک میرے ذہن میں رینگ رہا ہے ——— کیا کروں، چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں لیکن میں انھیں بھلا نہیں سکتا ——— در اصل میں بڑی باتیں نہیں کر سکتا، مجھ میں اتنی اہلیت ہی نہیں، اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہندستان کی آزادی پر ایک لمبا چوڑا مضمون لکھوں، میں تو اپنی کمزوریوں کا رونا رونا ہوں، اپنی شکستوں کو دہراتا ہوں، اپنی کمینگی کا احساس لوگوں کو دلاتا ہوں۔ یا کبھی کبھی دوسروں کی کمزوریوں کا چرچا کرتا ہوں ——— تو ہاں، میں تمھاری کمزوری کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں ——— اجازت ہے؟ مسکرا رہے ہو، ہنس رہے ہو؟ شاید تم اپنی کمزوری کو جانتے ہو، اگر میں اس کمزوری کو دہرا دوں تو کیا حرج ہے۔ اس وقت تم مجھ سے بہت دور ہو، کئی میلوں کا فاصلہ ہے، اسی لئے میں کھری کھری باتیں کہہ سکتا بات معمولی ہے، بہت ہی معمولی ——— بات کیا ہے کہ تمھیں ایک عورت سے محبت ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، ہر شخص ایک عورت سے محبت کرتا ہے، اور اگر تم کسی عورت سے محبت کرتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں، اس سے پہلے بھی تم عورتوں سے محبت کر چکے ہو، میں اُن عورتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، پہچانتا ہوں، میں نے اُنھیں دیکھا ہے تمھاری اُوشا اچھی تھی، خوب تھی، جسمانی طور پر وہ خوب صورت تھی، اور ذہنی طور پر بھی۔ اور وہ بنگالی لڑکی ——— اس کا جسم اب

تک میری آنکھوں کے سامنے تھرک رہا ہے۔ اور اس کی آواز میں کتنا سحر تھا، کتنی نسائیت تھی۔ اوشا خوب تھی، مانا بہت خوب، لیکن اب کیا ہوا ـــــ اور یہ نئی لڑکی۔ عجیب سی لڑکی ہے، میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں، میں نے اس سے اچھی طرح باتیں کی ہیں۔ میں اس کے خاندان کے ہر فرد کو جانتا ہوں۔ اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ہر عورت کی عزت کرتا ہوں، چاہے وہ کسی کی بیوی ہو، داشتہ ہو، بیوہ ہو، رنڈی ہو ـــــ میرے دل میں ہر عورت کی عزت ہے، اور عورت بھی تو انسان ہوتی ہے میں طوائف سے نفرت نہیں کرتا، وہ بھی قابل عزت ہے ـــــ شاید تم یہ سمجھو کہ میرے دل میں اس عورت کے لئے اس لئے جگہ نہیں کہ وہ بدنام ہو چکی ہے، میں بدنامی سے نہیں ڈرتا۔ وہ انسان ہی کیا، جو بدنام نہ ہو۔ وہ سمندر ہی کیا۔ جس میں طوفان نہ آئے ـــــ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ عورت اس سے پہلے کئی مردوں سے معاشقے لڑا چکی ہے ـــــ تو پھر کیا ہوا ـــــ عورت گر کر ابھر سکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی نے مسرت کے بہترین لمحے تمہیں دیئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس عورت کے دل میں جتنا ایثار، محبت، سچائی، تھی۔ تمہارے حوالے کر دیا۔

اور تم اس ایثار۔ اور سچائی سے اتنے مرعوب ہوئے، کہ تم نے باقی باتوں کو نظر انداز کر دیا ـــــ کیا اس لڑکی کو خوبصورت کہا جا سکتا ہے ـــــ شاید ـــــ لیکن خوبصورتی جسمانی تشکیل کا نام ہی نہیں۔ بدصورت آدمی بھی خوبصورت ہو سکتا ہے ـــــ میرا

مطلب ہے، کہ ذہنی طور پر، یا سیرت کے لحاظ سے ــــ میں تمہاری جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ آؤ۔ فرض کریں۔ کہ وہ خوبصورت ہے ــــ خوبصورت ــــ واقعی خوبصورت ــــ حسین ــــ حسین ــــ حسین ــــ میں جانتا ہوں، تم خوش ہو۔ بہت خوش ہو۔ عورت کو حاصل کر کے کون خوش نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے ــــ درست ہے ــــ عورت اچھی چیز ہے۔ میں عورت کی توہین نہیں کر رہا ہوں، عورت واقعی اچھی چیز ہے، عورت خوبصورت ہوتی ہے، ملائم ہوتی ہے، نرم ہوتی ہے، لچکدار ہوتی ہے، عورت زندگی ہوتی ہے۔ خوشی ہوتی ہے، عورت میں سورج کی گرمی ہوتی ہے، چاند کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ عورت سرسبز گھاس کی طرح ملائم۔ ریشم کی طرح نرم، شبنم کی طرح پاک اور صاف ــــ عورت۔ عورت۔ عورت۔ گہرا۔ عمیق۔ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔ اوس آہستہ آہستہ گر رہی ہے۔ اور ناریل کے درخت اس گھپ اندھیرے میں چپ چاپ استادہ ہیں۔ گرم۔ سانس۔ پھیلتا ہوا۔ اندھیرے میں اور پھیل جاتا ہے۔ نرمی اور نرم ہو جاتی ہے، سورج پگھلنے لگتا ہے، چاند اپنے مرمریں ہونٹوں سے شبنم کو چومتا ہے۔ اور چاند کی ٹھنڈی برفاب کرنیں۔ ناریل کے پتوں پر ناچتی ہیں ــــ اور اور، نزدیک بانہیں ملتی ہیں، ملتی ہیں۔ تاریکی ــــ نیم مدہوشی ــــ تاریکی گرم اور نرم انسانی وجود غائب، بالکل خلا، کچھ بھی نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں، کچھ

بھی نہیں۔ صرف خوشی۔ خوشی۔ یہ ٹھیک سب ہے، درست ہے لیکن کب تک ——— یہی تو پوچھتا ہوں۔ کب تک۔ مجھے اس عورت سے کوئی تغبض نہیں ——— شکایت نہیں، شکوہ نہیں۔ لیکن تم سے ہے ——— اگر کوئی اور آدمی ہوتا۔ تو میں اسے نظرانداز کر دیتا دنیا میں صرف عورت کی محبت ہی نہیں۔ انسانیت کچھ چیز ہوتی ہے۔ عورت کی محبت سے انسانیت کا رتبہ بلند ہے۔ اس سے پہلے میں نے شکایت کی ——— تم نے غور نہیں کیا ——— میں جانتا ہوں ——— سب کچھ جانتا ہوں۔ اور میں خاموش ہو گیا ——— اگر سب کچھ جانتے ہوئے انسان اس قسم کی حرکت کرے، تو پھر کس کا قصور ———

اس بار جب میں تمہارے پاس گیا ——— تو میں نے اپنے آپ کو بالکل اکیلا پایا۔ اور ایسا محسوس ہوا۔ کہ مجھے یہاں نہ آنا چاہئے تھا ——— اور تم کچھ کھوئے کھوئے سے رہے۔ اور مجھ سے الگ تھلگ تم نے عورت کی محبت میں سرشار ہو کر ہر شخص کو بھلا دیا۔ وہ محبت ہی کیا جو انسان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دے، یہ شکایت صرف میں ہی نہیں کر رہا ہوں۔ بالکل تمہارے جان پہچان والوں نے بھی، تمہارے دوستوں نے بھی کی ——— مگر تم نے پروانہ کی، اور مجھے رنج اس بات کا ہے۔ کہ وہ لڑکی صرف عورت ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اور تم صرف مرد ہی نہیں۔ بلکہ کچھ اور بھی ہو۔ یعنی ایک انسان ہو، اور ایک

انسان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی۔ کہ وہ اپنی زندگی کا محور صرف ایک عورت کو بنائے گا۔ اور تم سے یہ کبھی امید نہ تھی —— ہو سکتا ہے، کہ میں تمھیں اچھی طرح نہ سمجھ سکا ہوں۔ اور تم اس خطرناک راستے کو طے کر کے پھر اُسی راستے پر گامزن ہو جاؤ —— جس پر پہلے چل رہے تھے —— کیوں —— کیا بات ہے۔ ہنس رہے ہو —— رات اُسی طرح خاموش ہے۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ اور میری آنکھیں نیند سے چور ہو کر بند ہوتی جا رہی ہیں —— اور ہوا ناریل کے پتوں کو چومتی ہوئی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے۔ اب سو جاؤ —— سو جاؤ —— سو جاؤ ——

باپ۔ بیٹا۔ اور عشق

ناما میرے پاس دو سال سے نوکر ہے۔ اس دوران میں ناما نے میری ہر
طرح سے خدمت کی۔ یوں تو گھر کا کام کاج کرنا ہر نوکر کا فرض ہے۔ لیکن جب
مالک کی جیب میں روپے نہ ہوں، اور دو وقت کھانا بھی پکانا ہو، تو اس وقت ایک
عام نوکر اور ایک وفادار نوکر کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ ناما نے جب میری جیب
خالی دیکھی تو اس نے نوکری نہ چھوڑی۔ بلکہ مجھے اس بے کاری کے زمانے میں تسلی اور
تشفی دی، وہ ایک باپ کی طرح مجھ سے پیار کرتا، اور میری دیکھ بھال کرتا۔ اور
جب جیب میں پیسے نہ ہوتے تو کسی سے مانگ کر روٹی پکا لیتا۔ میرے ہاں آنے

سے پہلے وہ کسی انگریز کے پاس نوکر تھا۔ اس لئے وقت کا بہت پابند تھا۔ وہ جوتوں کا بھی خاص خیال رکھتا تھا۔ صبح اٹھتے ہی وہ جوتوں پر پالش کرتا۔ اور ان پر کپڑا گھس کر شیشے کی طرح چمکاتا۔ وہ چائے کا بہت شوقین تھا۔ اس لئے مجھے بھی چائے پینے کے لئے بہت مجبور کرتا، لیکن مجھے تو لسی سے رغبت تھی۔ میں اکثر ناشتہ بھی نہ کرتا تھا۔ دن میں دو بار اچھا، لذیذ کھانا مل جائے، تو سمجھو میرا دن بیت گیا۔

ایک ابر آلود شام کا ذکر ہے، کہ ناما میرے کمرے میں کچھ اداس اور مضمحل داخل ہوا،

"کیا بات ہے ناما؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا

"ارے صاحب، کیا بتاؤں، آج کل کے لڑکے اتنے بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ کہ گالی دینے کو جی چاہتا ہے"

"بات کیا ہوئی؟"

"حضور، میں نے اپنے لڑکے رامو کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ٹھہرائی تھی، میرا لڑکا اتنا پہنچ نکلا، کہ ایک آوارہ لڑکی سے شادی کر لی، اور اپنی اماں سے لڑ بھگڑ کر الگ کمرہ لے لیا"

"اس میں غصہ ہونے کی کیا بات ہے؟"

"واہ صاحب، آپ بھی خوب بات کرتے ہیں، بابو صاحب، میری مرضی کے بغیر وہ دوسری لڑکی کیساتھ کس طرح رہ سکتا ہے، اور اس کی یہ جرات کہ وہ میری مرضی کے بغیر ایک آوارہ لڑکی سے شادی کر لے۔ بابو صاحب اٹھارہ برس تک میں نے اسے پالا۔ پوسا اور جوان کیا۔ اور جب بات ماننے کا موقعہ آیا، تو

ایک ترنچ چھوکری کی بات مان لی، اور ہمیں صاف جواب دے دیا، اور صرف اتنی چھوٹی سی بات پر"

"یہ چھوٹی سی بات تو نہیں ہے ناما"

"آپ کے لئے نہیں ہو گی، مگر میرے لئے تو ہے، غضب کر دیا آپ نے صاحب، لڑکی نہ ہوئی پری ہو گئی، بھلا ایک ذلیل سی چھوکری کے لئے ماں باپ سے بگاڑ لینا کہاں کی شرافت ہے۔ اور پھر ایسی چھوکری، جو دوسروں سے آنکھ مٹکا تی پھرے، دن بھر سڑکوں پر گھومتی رہے، اور راہ گیروں سے مزے لے لے کے باتیں کرے، کوئی اچھے گھرانے کی لڑکی ہوتی تو میں خاموش رہتا۔ لیکن اس آوارہ چھوکری کے ساتھ میں اپنے لڑکے کی زندگی برباد نہ ہونے دوں گا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ میرا لڑکا اس چھوکری کا ساتھ چھوڑ دے، اور جہاں میں نے اس کی سگائی کی تھی وہ شادی کر لے، اور اگر میرا لڑکا میرا کہنا نہ مانے گا، تو نہ میں اس کا باپ، اور نہ ہی وہ میرا بیٹا"

یہ کہہ کر ناما کمرے سے نکل گیا، شام کے سائے اور گہرے ہو گئے تھے، اور ہوا تیز اور تند ہو گئی تھی۔ اور میں یہ سوچنے لگا، کہ آج کل کے باپ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وہ بھی دیکھ بھال اور پالن پوسن کا خراج وصول کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ چونکہ آپ نے ایک لڑکے کو پالا پوسا، اور جوان کیا۔ اس لئے آپ اس کی شادی جہاں چاہیں کر دیں۔

چند دن اور گذر گئے۔ میں نے ناما سے یہ نہ پوچھا کہ اس کے بیٹے کا کیا

حال ہے، یا خود اس کا کیا حال ہے۔ وہ کچھ پریشان اور اداس رہنے لگا، جیسے اُسے اس بات پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا، کہ اس کے لڑکے نے اس کی بات کیوں رد کر دی۔ اس کی چھوٹی سی محدود زندگی میں صرف تین افراد تھے، جن پر وہ حکومت کر سکتا تھا۔ ایک تھی اس کی بیوی، دوسرا اس کا بیٹا، اور تیسری اس کی لڑکی۔ ان تینوں پر رعب جمانے کا اسے پورا حق ملنا چاہیئے۔ اگر یہ تینوں اس کا حکم نہ مانیں تو وہ کہاں جائے۔ وہ کس پر رعب جمائے۔ وہ بھی سچا تھا، لیکن بات بنتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایک دن جونہی میں بستر سے اٹھا، تو برامدے میں شور وغل سنائی دیا۔ میں برامدے میں آیا۔ ناما، اس کا لڑکا رامو، اور ایک لڑکی برآمدے میں کھڑے بحث کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے، کیوں چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"وہی بات ہوئی صاحب، جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں کتنی بار اس لونڈے سے کہہ چکا ہوں کہ اس لونڈیا کا ساتھ چھوڑ دو، یہ تمھیں کہیں کا نہ رکھے گی۔ لیکن یہ لونڈا تو میری بات مانتا ہی نہیں۔ حضور یہ ہے اس کی بیوی، نری چھپکلی دکھائی دیتی ہے۔ آنکھیں دیکھیئے اس کی، کتنی بے حیائی ٹپکتی ہے ان سے"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا، کافی گوری چٹی اور ہٹی کٹی تھی، عمر ہوگی چودہ برس، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، لیکن تیز اور ذہین، ناک پتلی اور موزوں ——— اس نے میری طرف لاپروائی سے دیکھا، اس کی آنکھیں شرمندہ نہ تھیں، بلکہ صاف کہہ رہی تھیں ——— میں تو بالکل بے قصور ہوں۔ میں شالیمار میں اکسٹرا کا کام کرتی تھی، اور یہ لونڈا وہاں ایک ہیرو کا کھانا لاتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو

دیکھا، اور پھر محبت کی داستان شروع ہو گئی۔ لڑکے نے کہا۔ میں تم سے شادی کروں گا، اور تمھیں کما کر کھلاؤں گا، میں نے کہا، اچھی بات ہے، تم کما کر لاؤ، اور میں تمھاری خدمت کروں گی —— اور پھر ہم دونوں نے شادی کر لی ——

"کیا دیکھ رہی ہے میرے صاحب کی طرف، تیری ان آنکھوں کو آگ لگے"

"گالی نہ دو ناما"۔ میں نے چڑ کر کہا

"آپ نے اس کی نئی حرکت نہیں سنی، جہاں میرا بیٹا نوکر تھا، وہاں یہ چھوکری بھی نوکر ہو گئی۔ کچھ دن آرام سے وہاں نوکری کی، لیکن بری عادتیں کہاں ساتھ چھوڑتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد اس چھوکری نے مالکن کی ساڑھیاں چرائیں انھوں نے فوراً معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ بس پھر کیا تھا، دونوں پونا سے بمبئی بھاگ آئے اب پولیس سے جان بچاتے پھرتے ہیں۔ لیکن میں ان دونوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گا تاکہ انھیں عشق کا مزا مل جائے"

"کیا یہ سچ بات ہے رامو؟"

رامو خاموش ہو گیا، جیسے وہ اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہو۔

"ارے صاحب، دراصل میرا لڑکا اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہے، میں اپنے لڑکے کو جانتا ہوں، یہ بچارا نہایت سیدھا سادا تھا، نہ منہ میں زبان اور ہی دل بے ایمان۔ یہ ساری بدمعاشی اس لڑکی کی ہے۔ اس لڑکی نے میرے لڑکے کو چوری کے لئے اکسایا ہو گا۔ بڑی جادوگرنی ہے یہ، پتہ نہیں، کیا کھلا، پلا دیا ہے کہ لٹو بنا پھرتا ہے"

رامو خاموش کھڑا تھا، وہ اپنے جوتوں کی طرف دیکھ رہا تھا، اور ناما کی باتیں سن رہا تھا، وہ حیران تھا کہ کیا کہے۔ البتہ اس کی بیوی یہ باتیں سُن رہی تھی، اور ناک بھوں چڑھا رہی تھی، جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ کیا یہی دن دکھلانے کے لئے مجھ سے شادی کی تھی۔ اگر خاوند بننے کی ہمت نہ تھی، تو مجھ سے شادی کی کیوں تھی ——— اور رامو کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا ——— دیکھ برا ماننے کی کوئی بات نہیں، یہ میرا باپ ہے۔ اور باپ کو حق ہے کہ وہ بیٹے کو نصیحت کرے، اور اس کی نصیحت پر میں عمل کروں یا نہ کروں۔ یہ میری اپنی مرضی ہے اور میری مرضی وہی ہے، جو تیری ہے۔ اس کی گالیوں کی پرواہ نہ کر۔ میں نے تیرا ہاتھ پکڑا ہے اور اسے عمر بھر نہ چھوڑوں گا ———

"چلو حوالات"۔ باپ نے دونوں کی طرف زہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا "جب وہاں چکی پیسنی پڑے گی، تو پھر میری نصیحتیں یاد آئیں گی۔ جب وہاں ڈنڈے پڑیں گے، پاؤں میں بیڑیاں پڑیں گی، سوکھی روٹیاں کھانی پڑیں گی، اور دن رات کام کرنا پڑے گا۔ جب تمہیں باپ کی باتیں یاد آئیں گی، اِس وقت تو تم عشق کے نشے میں چور ہو، تمھیں باپ کی عزت کا کیا خیال ——— خیر ——— چل ——— چل حوالات میں"

یہ شور و غل سن کر ساتھ والی کوٹھی کے نوکر بھی آ جمع ہوئے۔ چچی فکروان میں سب سے آگے تھا۔

"کیا ہوا ناما؟"

"ارے ہو اکیا، اس لڑکے نے اس لڑکی سے شادی کرلی، میں اس کا باپ ہوں، اور یہ میرا بیٹا ——— اور یہ ہے بدمعاش چھوکری، میرے گھر کو برباد کرنے والی، میں نے اپنے لڑکے کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ٹھہرائی تھی لیکن میری مرضی کے خلاف اس نے اس جاہل، اجڈ، آوارہ گرد چھوکری سے شادی کرلی، اور پھر جہاں نوکری کرتے تھے، وہاں چوری کی، اور سیدھے بمبئی بھاگ آئے، یہ ہے ان کی کرتوت ———"

"ارے، مار سالے کو چار تھپڑ، کل کا لونڈا اور باپ کا کہنا نہ مانے، نہ اپنی عزت کا خیال نہ ماں باپ کی عزت کا دھیان، بڑا آیا موتی لال کا بچہ ———"

"کون موتی لال؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے صاحب، یہی ایکٹر وکیٹر، یہ لونڈے فلمیں دیکھتے ہیں، اور فلمیں دیکھ کر چھوکریوں سے عشق کرتے ہیں، اور پھر سیدھے جیل جاتے ہیں"

"میں ابھی ان دونوں کو پولیس کے حوالے کرتا ہوں"، ماما نے جوش میں آکر کہا۔

"بابو صاحب"، فکرو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج کل کے لونڈوں کا کیا کہنا، واقعی کل جگ آگیا ہے، آج کل تو عورتوں کا راج ہے، جس طرف دیکھو، عورتیں، گھروں میں، گاؤں میں، شہروں میں، سنیماؤں میں، کچہریوں میں، کلبوں میں، بازاروں میں، ہر جگہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں کھڑی نظر آتی ہیں، اور مرد عورتوں کے پیچھے پیچھے، بچے اٹھائے ہوئے، تھیلے لئے ہوئے، بیوی کے جوتے اٹھائے ہوئے، پیچھے پیچھے گھوم رہے ہیں، تھر مارہے ہیں،

ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ اندر چلے جا رہے ہیں۔ ارے صاحب ہم نے بھی شادی کی تھی، ایک ہی نہیں دو دو۔ سن او لونڈے بڑا تیس مار خاں بنا پھرتا ہے، اور لونڈیا کو لے کر اس طرح گھومتا ہے، جیسے ہم نے کبھی لونڈیا دیکھی ہی نہیں جب ہماری بیوی گھر میں آئی، تو اسے دیکھتے ہی ہمارے ہوش اڑ گئے، ارے کیا چیز تھی وہ، نرا چاند کا ٹکڑا، ذات کی چمارن تھی، لیکن رنگ روپ میں اس قدر چمک تھی، کہ انسان آنکھیں ملتا رہ جائے۔ بابو صاحب، اس چمارن کا جسم تھا کہ جیسے مخمل، ہاتھ لگاؤ، تو میلا ہو جائے ـــــ اور آنکھیں ـــــ ہائے اللہ! اور کمر ـــــ توبہ، توبہ، اور جب بات کرے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے قینچی ہے، قینچی ـــــ ہم تو اس کی نظروں کے گھائل ہو گئے تھا۔ لیکن جب آنکھ کھلی، تو معاملہ چوپٹ تھا، کل کی چھوکری، اور لگی میکہ ماں باپ کی بے عزتی کرنے، سُن بے چھوکرے، کیا گھور گھور کر ماں کی طرف دیکھ رہا ہے، مرد کا بچہ ہے، تو مرد کی طرف دیکھ، یہ سالی کہیں بھاگ نہ جائے گی، ہاں تو بابو صاحب وہ کہنے لگی ـــــ میں سیوا نہ کروں گی، میں تمھارے ماں باپ کی روٹی نہ پکاؤں گی۔ میں ان کے جھوٹے برتن نہ صاف کروں گی ـــــ میں یہ جواب سن کر تلملا گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا، میں نے غصے میں آ کر کہا ـــــ دیکھ، تجھکو اگر کام کرنا ہے، تو ڈھنگ سے کر، بیوی کا یہ مطلب نہیں، کہ تو میرے ماں باپ کے سر پر چڑھ بیٹھے، وہ بچارے کہاں سے کھائیں، کہاں رہیں، اس بڑھاپے میں کہاں جائیں، اگر تو میرے ماں باپ کی سیوا نہ کرے گی، تو اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔

"میں تمھارے ماں باپ کی سیوا نہیں کر سکتی"، جھمکو نے فوراً دو ٹوک جواب دیا، سالی نے ایک سیکنڈ بھی نہیں سوچا۔

"تو نکل جا میرے گھر سے"، میں نے غصے میں آ کر کہا

"اور وہ نکل گئی، شاید وہ سمجھتی تھی کہ میں اُسے منانے آؤں گا۔ میں اس سے کہوں گا۔ معاف کر دے جھمکو، تو ہی گھر کی مالکن ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو گھر سے نکال دیتا ہوں۔ لیکن ناما، جس دن وہ گھر سے نکلی، اس دن کے بعد میں نے اس چڑیل کا منہ نہیں دیکھا، میں نے اس کی یاد کو دل سے مٹا دیا، میں اس کی صورت کو بھول گیا، میرے لئے وہ اسی دن مر گئی تھی، جس دن اس نے گھر سے باہر قدم رکھا تھا، چھ مہینے کے بعد میں نے دوسری شادی کر لی۔ اور اپنی دوسری بیوی سے صاف کہہ دیا، کہ تمھیں والدین کی سیوا کرنی ہو گی، اگر تمھیں یہ بات منظور ہے، تو رہو اس گھر میں نہیں تو جاؤ اپنے گھر، بچاری اچھے گھرانے کی ہے، میری لاج رکھ لی، اور ہم سب لوگ بڑی خوشی سے اکٹھے رہتے ہیں"

"سن لیں، چچا فکرو کی باتیں؟"، ناما نے خوش ہو کر کہا "تم اس چھوکری کو چھوڑ دو گے یا نہیں؟"

راموخاموش کھڑا تھا،

اس کی بیوی اُسے دیکھ رہی تھی۔ امتحان کا وقت تھا۔ ایک طرف باپ کی محبت تھی، اور دوسری طرف فرض تھا۔

"بولتے کیوں نہیں؟"، ناما نے کڑک کر کہا

"نہیں، کبھی نہیں"، رامو نے جواب دیا۔

"تو چلو، پولیس میں"

"چلو"

تینوں چل پڑے

"ٹھہرو" میں نے کہا

"میں انھیں حوالات میں بھیج کر ہی دم لوں گا، ذرا ان دونوں کو عشق کا مزا مل جائے"، نانا بولا۔

"اگر تمھارا بیٹا جیل میں چلا گیا، تو تمھیں کیا ملے گا؟ - رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی"،

"دل کو ڈھارس ملے گی، چین ملے گا۔ ٹھنڈک پڑے گی۔ اور کیا"،

"اپنے بیٹے کو جیل میں بھیج کر؟"

"جی ہاں"

"سوچ سمجھ کر بات کرو نانا، جلدی نہ کرو۔ اگر تمھارا بیٹا، تمھارا کہنا نہیں مانتا تو چھوڑ دو، اُسے، کمانے کھانے دو۔ دیکھو نانا۔ زمانہ بدل گیا ہے، زمانے کی پرانی قدریں بدل گئی ہیں۔ جب بیٹا جوان ہو جائے، تو اُسے اپنا دوست سمجھو، اس وقت یہ مت خیال کرو کہ تم اس کے باپ ہو، ہاں تم نصیحت کر سکتے ہو۔ لیکن نصیحت ٹھونسنا، کہاں کی شرافت ہے؟ تم خود کماتے ہو، کھاتے ہو، تم اس کی کمائی پر زندہ نہیں ہو۔ تو پھر کیوں باپ کی لاش کو بیٹے کے سامنے گھسیٹ رہے ہو ——"،

"اگر آپ کا بیٹا اس طرح کی بات کرتا بابو صاحب، تو آپ کیا کرتے؟"

"میں اس سے صاف کہتا: جاؤ، میرے بیٹے، خود کماؤ، کھاؤ، اور دونوں زندگی کو خوشی سے نبھاتے رہو"۔۔۔۔۔ پھر میں نے راموسے کہا "سنو رامو ۔۔۔ جاؤ، اس لڑکی کو لے جاؤ، جہاں تمھارا جی چاہے ۔ چلے جاؤ ۔۔۔ اور ایک نئی زندگی شروع کرو۔ اور اگر زندگی میں شکست کا سامنا کرنا پڑے، تو اپنے باپ کو منہ نہ دکھانا"

رامو اور اس کی بیوی میرے سامنے نظروں سے اوجھل ہو گئے، جاتے وقت راموکی آنکھوں میں آنسو تھے، اور ماما کی آنکھوں میں بھی ۔۔۔۔۔۔
ایک رشتہ ٹوٹ رہا تھا، اور دوسرا رشتہ بن رہا تھا۔ ۔۔۔۔۔۔

روزی

میرے پاس روزی اور جوزف دونوں آتے تھے۔ روزی کی عمر ہو گی چالیس برس ــــ اور جوزف تو اب بوڑھا ہو گیا تھا، چہرے پر جھریوں کا ایک جال سا تھا۔ اور سر کے بال سفید ہو گئے تھے، وہ فوج میں کام کر چکا تھا۔ اس لئے بات چیت میں ابھی تک اکڑفوں تھی، وہ اکثر سوٹ پہن کر آتا۔ اور خوبصورت نکٹائی پہننے کا اُسے بہت شوق تھا۔ زندگی میں اس نے اچھے دن دیکھے تھے۔ اس لئے اس میں کمینگی اور ریاکاری بہت کم تھی۔ اگر کبھی کبھار اس کی جیب میں روپے ہوتے، تو وہ دونوں کو روپے دینے سے کبھی انکار نہ کرتا۔ اور روزی، تو ادھیڑ عمر کی عورت دکھائی دیتی تھی۔ جوانی تو واقعی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن روزی کے ذہن

میں اس بات کا ضرور احساس تھا۔ اگر وہ ایک شاندار سکرٹ پہن کر بازار میں سے گذرے گی، تو لوگ ضرور اس کی طرف شوق کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ہر عورت کو خوب صورت بننے کا شوق رہتا ہے۔ اس لئے جب کبھی روزی اچھی سی ساڑھی پہن کر آتی۔ یا خوبصورت سکرٹ پہنتی۔ تو واقعی اس کا بڑھاپا کم ہو جاتا، اور اس بات کا شبہ ہونے لگتا۔ کہ وہ بوڑھی نہیں ہے۔ ابھی تک اس میں زندگی کی رمق ہے۔ بننے اور سنورنے کی آرزو ہے۔ کبھی کبھی وہ بیٹھے بٹھائے اپنی پنڈلیوں کو برہنہ کر لیتی۔ اور سگرٹ کا کش لگا کر جوزف سے بحث کرنے لگتی ایک بات تو صاف عیاں تھی۔ کہ روزی بدصورت تھی۔ ماتھا گھٹا ہوا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ اور ہونٹ موٹے موٹے، باقی جسم میں کچھ کشش ضرور تھی، جس کو روزی برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔

دونوں کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ دونوں ہمیشہ اکٹھے آتے۔ اکٹھے سینما جاتے۔ اکٹھے کھانا کھاتے، اور اکٹھے ایک ہی ہوٹل میں رہتے۔

جوزف ذرا سخت طبیعت کا انسان تھا۔ ملٹری کی اکڑ فوں اسی طرح قائم تھی، اسی لئے وہ روزی پر کافی رعب جماتا تھا۔ جب کبھی دونوں بحث کرتے کرتے زیادہ اُلجھ جاتے۔ تو جوزف اُسے ایک کیپٹن کی طرح خاموش رہنے کا آرڈر دیتا تھا اور ساتھ انگلش میں ایک دو گالیاں سنا دیتا۔ روزی گالیاں سن کر اکثر خاموش ہو جاتی۔

دونوں کا آپس میں کیا رشتہ تھا۔ یہ میرے لئے معمہ ہی رہا۔ کیا دونوں بھائی بہن تھے، یا بیوی خاوند، یا محض دو دوست، اس کی وضاحت

دونوں نے کبھی نہ کی۔ ان ملاقاتوں کے دوران میں جوزف نے روزی کو کبھی مائی ڈارلنگ نہ کہا۔ اور نہ ہی بیوی کا لفظ اس کے منہ سے نکلا۔ اور نہ ہی جوزف نے پیار بھرے انداز سے روزی کی طرف دیکھا۔ دراصل جوزف کے سلوک میں ایک قسم کی شقاوت اور بہمیت ٹپکتی تھی، جوزف نے میری موجودگی میں کبھی روزی کے گالوں کو نہ چھوا۔ اور نہ ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اور نہ ہی کبھی عاشق معشوق کی سی باتیں کیں، دونوں آتے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔

ان دنوں دونوں بیکار تھے۔ ایک عرصہ ہوا کہ دونوں ایک فرم میں نوکر تھے۔ فرم فیل ہو گئی۔ اور دونوں پر اس طرح بیکاری کی مہر ثبت ہو گئی، جوزف کبھی کبھی جوش میں آکر فرم والوں کو گالیاں دیتا۔ کبھی اٹھ کر، کبھی بیٹھ کر کبھی ہاتھ بڑھا کر، کبھی کمرے کا چکر لگا، مسیح کو صلواتیں سناتا۔ روزی اکثر یہ باتیں سنتی، اور جب جوزف آپے سے باہر ہو جاتا، تو وہ اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتی۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتی "جوزف مسیح کو مت گالیاں دو۔ اس نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ اور تمھیں کس بات کی فکر ہے، جب تک میں زندہ ہوں۔ تم بھوکے نہیں مر سکتے۔ میں نوکری کروں گی، میں لوگوں کے کپڑے سیوں گی، میں فرش صاف کروں گی۔ لیکن تمھیں بھوکا نہ مرنے دوں گی۔"

"روزی کیا تم نہیں جانتیں۔ میرے پاس آج سگرٹ ایک پیکٹ بھی نہیں۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا، دن بھر مارا مارا پھر تا رہا ہوں۔ کبھی اس جگہ۔ کبھی اس جگہ۔ لیکن کم بخت نوکری نہیں ملی"۔

مل جائے گی

کب ملے گی

خدا دے گا

میں ایسے خدا کو نہیں مانتا۔ اور زندگی بھر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ نہایت ایمانداری سے کام کرتا رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی بیکار ہوں، اور خاص کر اس بڑھاپے میں!

اور اسطرح جوزف اور روزی دونوں آپس میں لڑتے، جھگڑتے، جوزف روزی کو گالیاں دیتا اور وہ چپکے سے سنتی۔ اور کبھی کبھی میرے سامنے ہی وہ جوزف کی جیب میں ایک دو روپے ڈال دیتی۔ سگرٹ کا پیکٹ اس کے حوالے کرتی اور اس طرح اس کی دیکھ بھال کرتی۔

اور اسی لڑائی جھگڑے میں کئی دن گزرتے گئے۔ روزی کپڑے سی کر جوزف کی مدد کرتی۔ اگر کہیں سے اُسے کچھ روپے مل جاتے، تو وہ جوزف کو ضرور روپے دیتی۔ اس کا ضرور خیال رکھتی۔ ایک روز روزی پھر میرے کمرے میں آئی۔

تم نے جوزف کا نیا کوٹ دیکھا

نہیں تو

وہ میں نے سی کر دیا ہے

بہت اچھی بات ہے۔

میں اپنی بہن سے پچاس روپے مانگ کر لائی تھی۔ اُس میں سے میں

ہے میں نے اس کے دو بُش شرٹ سے لئے۔

'بہت اچھی بات ہے'

'اب وہ نوکر ہو گیا ہے'

'بہت خوب'

'لیکن وہ میری پرواہ نہیں کرتا'

'کیا مطلب'

'میرا مطلب یہ ہے کہ جب اُسے تنخواہ ملے گی، تو اس میں سے وہ ایک پائی بھی مجھے نہ دیگا'

'وہ کیوں۔ اور اگر وہ نہیں بھی دے گا، تو کیا بات ہے، آخر تم دونوں ایک ہی ہو'

'کیا کہا تم نے' وہ چونک کر بولی

'میرا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں دوست ہو' ۔میں پینترا بدل گیا

وہ میری بات سمجھ گئی تھی۔شاید وہ آج خاموش نہ رہنا چاہتی تھی۔

'کیا تم یہ نہیں جانتے کہ جوزف کی بیوی ابھی تک زندہ ہے'

'جوزف کی بیوی' ۔میں نے سوالیہ انداز میں کہا

'ہاں ہاں، جوزف کی بیوی زندہ ہے۔اس کی تین لڑکیاں ہیں۔ دو لڑکے ہیں۔ ہر مہینے وہ اپنی بیوی کو خرچ بھیجتا ہے۔گو وہ دو سال سے اپنے گھر نہیں گیا۔لیکن جب کبھی اُسے تنخواہ ملتی ہے، تو سب سے پہلے وہ اپنی بیوی کو تنخواہ بھیجتا ہے۔پانچ چھ مہینوں سے وہ بیکار تھا، لیکن اس عرصے میں

اس کی بیوی کو پچیس تیس روپے بھیج دیا کرتی تھی۔

'اور تم کیا ہو'، ۔میں نے جل کر کہا

'میں، میں، میرا خاوند زندہ ہے، وہ بمبئی میں رہتا ہے'

'کیا تم اپنے خاوند سے ملتی نہیں'

'نہیں'

'وہ کیوں'

'یہ سن کر کیا کرو گے'! وہ اپنی جگہ سے سرک کر، پھر آرام سے صوفہ پر بیٹھ گئی۔ جیب سے چار مینار کا سگرٹ نکالا۔ اور اس کو سلگا کر کہنے لگی "میں اکثر یہ باتیں لوگوں کو بتاتی نہیں، اور لوگوں کو کہنے سے کیا فائدہ۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ مجھے جوزف کی بیوی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ مجھے اس کی معشوقہ سمجھتے ہیں وہ لوگ ہی نہیں، بلکہ میرے رشتہ دار، میری بہنیں، میرے دوست، لیکن میں کسی سے کچھ نہیں کہتی کہ میں جوزف کی بیوی ہوں یا نہیں۔ اگر لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، تو کریں۔ مجھے کیا۔ میں کیوں ان باتوں کی پرواہ کروں، بہر حال چونکہ تم نے یہ سوال کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جوزف میرا خاوند نہیں ہے، میرا خاوند الفریڈ ہے ـــ الفریڈ ہے، اور وہ ابھی تک زندہ ہے، میرے دو بچے ہیں، وہ بھی زندہ ہیں۔ وہ اب دونوں فرموں میں کام کرتے ہیں۔ اپنا کماتے اور اپنا کھاتے ہیں۔ میں ان سے ملتی ہوں، لیکن ان سے کبھی روپے نہیں مانگتی اور نہ ہی کبھی میں نے اپنی غربت کا اظہار کیا ـــ میں ۱۶ سال کی تھی جب میری شادی الفریڈ سے ہوئی تھی۔ میرا باپ مجسٹریٹ تھا، میرا بھائی فوج میں کپتان

ہے۔ میری ماں بھی اچھے گھرانے کی تھی۔ شادی ہوئی، اور شاندار شادی ہوئی میں نے اور الفریڈ نے تین سال بڑے اچھی طرح گزارے۔ یہ تین سال میں ساری عمر نہیں بھول سکتی۔ ان دنوں الفریڈ، بہت ہی اچھا تھا۔ وہ مجھے سینما لے جاتا، ناچ گھر میں لے جاتا، ہم سیر کرنے اکٹھے جاتے، ہوٹل میں اکٹھے جاتے اور اکثر شراب اکٹھے پیتے، پہلے سال ہی ایک بچہ پیدا ہوا، دوسرے سال کچھ نہ ہوا، تیسرے سال میں پھر حاملہ ہو گئی۔ اور الفریڈ نے مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ میں ہسپتال میں دو مہینے رہی۔ اب کے پھر لڑکا پیدا ہوا۔ اب میں کافی کمزور ہو گئی تھی۔ رہا سہا شباب جاتا رہا۔ صورت پہلے ہی مکروہ تھی، اب زیادہ خراب ہو گئی۔ اس لئے جب میں واپس گھر آئی، تو کافی لاغر ہو چکی تھی، ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کے لئے کہا تھا۔ گھر آتے ہی میں نے سب سے پہلے ایک لڑکی کو دیکھا۔ یہ اینگلو انڈین لڑکی تھی، ہو گی ۱۷ سال کی۔ کافی جوان اور خوبصورت، اگر میں بدصورت تھی تو دنیا واقعی خوب صورت تھی، اس کا سفید رنگ، اس کی نیلی نیلی آنکھیں واقعی دلفریب تھیں، اس نے سکرٹ پہنی ہوئی تھی، اس کی پنڈلیاں سڈول اور سفید تھیں، اس کی کمر پتلی اور کولھے بھاری ——— یہ لڑکی میرے پڑوس میں رہتی تھی، الفریڈ نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں مر گئی ہے، اور اب بے چاری یتیم رہ گئی ہے۔ اس لئے اس کو گھر کے کام کاج کے لئے رکھ لیا گیا ہے۔ میں نے یہ جواب سنا، اور چپ ہو گئی۔ یہ ہسپتال سے واپسی کی پہلی رات تھی۔

ہم سب ایک کمرے میں سوتے، ہمارے پاس صرف ایک کمرہ تھا

کمرے میں دو چارپائیاں تھیں، ایک پر میں سوئی اور دوسری پر الفریڈ اور وینا چارپائی پر سو گئی، دونوں بچے میرے ساتھ سو رہے تھے، رات کافی گزر چکی تھی، لیکن آنکھوں میں نیند نہ تھی، کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے آنکھوں میں نیند عنقا تھی، وینا کی موجودگی نے مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس لئے آنکھوں میں نیند نہ آتی ۔ میں نے سونے کی کوشش کی، لیکن سو نہ سکی، شاید ایک دو بار نیند کا جھونکا آیا ہوگا۔ اور اب جب میں نے آنکھ کھولی، تو وینا کو الفریڈ کے ساتھ سوتے ہوئے پایا۔ یہ دیکھ کر میرے بدن میں آگ سی لگ گئی، آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جی میں آیا، کہ اسی وقت دونوں کا گلا گھونٹ دوں ۔ لیکن دماغ نے کہا ایسا مت کر، ۔ میرا بچہ میرے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا، اور دودھ پی رہا تھا ۔ اگر میں نے اس وقت کچھ کہا، تو شاید الفریڈ مجھے اسی وقت گھر سے نکال دے میں نے سوچا، ذرا تندرست ہو جاؤں، اُٹھنے بیٹھنے لگوں تو پھر اس نوکرانی کو باہر نکال دوں گی، اور الفریڈ کو خوب کھری کھری سناؤں گی۔ اور یہی باتیں سوچتے سوچتے صبح ہو گئی ۔

صبح ہوئی اور پھر شام آئی، اور اسی طرح کتنے دن گزر گئے۔ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تھی، دونوں کا عشق اب ناقابل برداشت ہو چکا تھا ۔ اور ایک دن میں نے الفریڈ سے اس بات کی شکایت کی ۔

الفریڈ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ گویہ آنکھیں جانی پہچانی تھیں، لیکن آج بالکل اجنبی دکھائی دیتی تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے الفریڈ مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہو، اور کہہ رہا ہو، تم کتنی بدصورت ہو ۔ تمہارا رنگ کالا ہے،

تمہارا ماتھا چھوٹا ہے، تمھارے بال سخت اور کھردرے ہیں۔ تمھارے جسم میں رعنائی نہیں، تمھارے چہرے پر رنگ نہیں، روپ نہیں۔ گو تمھاری عمر ۱۹ برس کی ہے، لیکن تیس برس کی بوڑھیا دکھائی دیتی ہو، اور مجھے ویٹا پسند ہے۔ یہ میری ڈارلنگ ہے، اس کا رنگ سفید ہے، اس کی چمڑی گوری ہے، اس کی آنکھیں نیلی ہیں، اس کی باتوں میں رس ہے، اس کی آنکھوں میں چالاکی ہے، یہ بہت اچھا ڈانس کرتی ہے، مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ اور جب شراب پی کر مجھ سے باتیں کرتی ہے، تو زندگی کا لطف آجاتا ہے۔"

الفریڈ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ اور کہا "اگر اس گھر میں رہنا ہے تو اسی طرح رہنا پڑے گا۔ ویٹا یہاں ہی رہے گی۔ اور اس گھر میں رہے گی، اور اگر تم یہاں سے جانا چاہتی ہو، تو بڑی خوشی سے جا سکتی ہو"

میں یہ جواب سن کر خاموش ہوگئی۔ یہاں بحث فضول تھی۔ اب معاملہ صاف اور واضح تھا۔ میں ان دو بچوں کو لے کر کہاں جاتی۔ ان کی پرورش کہاں کرتی، ان کی دیکھ بھال کیسے کرتی، اپنا پیٹ کیسے بھرتی، میں گیارہ سال اس گھر میں رہی۔ وہ گیارہ سال میں نے کیسے گزارے، میں نے کیسی کیسی خوشامد کی میں نے کیسے کیسے غم سہے۔ میں نے کتنی بار الفریڈ کے جوتے کھائے۔ اس نے مجھے مارا پیٹا، مجھے گندا کھانا کھلایا۔ کبھی نمک زیادہ ہوتا، اور کبھی بالکل کم، مجھے برتن صاف کرنے پڑتے، جھاڑو دینا پڑتی۔ کمرہ صاف کرنا پڑتا، اور ویٹا اور الفریڈ کی گھرکیوں کو سننا پڑتا۔ الفریڈ ہمیشہ بچوں سے گریز کرتا۔ نہ ان سے پیار کرتا، اور نہ ہی ان سے پیار کا اظہار کرتا، دونوں اکثر سینما جاتے، ہوٹلوں میں جاتے، ڈانس

کرنے جانے اور شراب پی کر آنے، اور میں گھر میں سڑتی رہتی، کڑھتی رہتی، اور دونوں کی گالیاں سنتی رہتی۔ لوگوں نے الفرڈ کو سمجھایا، لیکن وہ نہ مانا۔ میرے والدین نے سمجھایا، لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے دیٹا کی خاطر ایک بار نوکری بھی چھوڑ دی، لیکن اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ایک دن تو اس نے غضب ہی کر دیا۔

میرے پاس آکر کہنے لگا: تم نری کتیا ہو!

'کیا ہوا'۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا

'تم ۔۔ تم ۔۔ you bloody bitch ۔۔ تم نے مجھے آتشک دیا۔ دیکھو۔ ادھر دیکھو۔ آج ہی اس بیماری کا ٹیکہ لگوا کر آیا ہوں۔ معلوم نہیں تم کن لوگوں کے ساتھ سوتی ہو۔ کتیا کہیں کی، نکل جا میرے گھر سے، فوراً نکل جا"

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں اپنی ماں کے پاس گئی، ڈاکٹر سے معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا کہ تمھیں کوئی بیماری نہیں ہے،

یہ سن کر مجھے غصہ آیا۔ تب میں نے سوچا کہ اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر اس شخص نے یہ بیماری مجھے دے دی، تو میں کیا کر دوں گی، اور اب منت سماجت سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اس جہنم سے نکلنا ہی بہتر ہے۔ میں اسی دن بھاگ کر چچا کے گھر آ گئی، یہاں آکر پہلی بار میں جوزف سے ملی۔ اس کی ماں سے، اس کی بیوی سے ملی۔ ان لوگوں نے میری بہت خاطر کی۔

مجھے اچھی طرح اپنے گھر میں رکھا۔ میری خدمت کی، مجھے اپنا جانا، اور مجھے احساس نہ ہونے دیا، الفرڈ نے میرے بچوں کو ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت کا خرچہ وہ خود برداشت کرتا تھا۔

اور پھر تیسری جنگ شروع ہو گئی، الفریڈ فوج میں بھرتی ہو گیا اور عراق چلا گیا۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب وہ پونا آیا تھا، اور وہ عراق جانے والا تھا۔ میں ایک بار پھر الفریڈ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ میں پلیٹ فارم پر چلی گئی، اور گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ وقت مقررہ پر گاڑی آئی۔ میں نے الفریڈ اور ویٹا کو گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا، دونوں خوش وخرم تھے، دونوں ہنستے۔ باہوں میں باہیں ڈالے، اسٹیشن سے باہر چلے گئے۔

الفریڈ فوج میں بھرتی ہو کر عراق چلا گیا۔ اور میں فوج میں بھرتی ہو کر سارجنٹ ہو گئی۔ میری اچھی خاصی آمدنی تھی۔ کبھی کبھی میں بچوں سے ملنے جاتی اور انھیں دیکھ کر دل کو تسلی دیتی، الفریڈ عراق سے برابر انھیں روپے بھیجتا تھا، الفریڈ کے چلے جانے کے بعد میں نے کئی بار ویٹا کو دیکھا۔ وہ کبھی اکیلی نہ ہوتی، اکثر اس کے ساتھ ایک امریکن سپاہی ہوتا، مجھے معلوم تھا کہ الفریڈ ویٹا کو ہر مہینے روپے بھیجتا ہے، اور مجھے یہ دیکھ کر بڑا غصہ آتا کہ وہ روپے تو میرے خاوند سے منگواتی ہے، لیکن عیش دوسروں سے کرتی ہے۔

ایک بار وہ EROS میں مل گئی۔ وہ اپنے امریکن عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی تھی، بے حیا لڑکی۔ اس کے مکروہ ہونٹوں پر لپ اسٹک تھی، اور اس کے سنہری بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے، اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت جھلکتی تھی، بے حیائی ٹپکتی تھی، میں نے اس کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگی، اور اپنے امریکن عاشق کے ساتھ چمٹ گئی، اور میں وہاں سے چلی آئی۔

جنگ ختم ہو گئی ـــ الفریڈ واپس آیا۔
وہ اپنے گھر گیا۔
مکان پر تالا لگا ہوا تھا۔
ویٹا بھاگ گئی تھی
الفریڈ نے ویٹا کی بہت تلاش کی، لیکن وہ نہ ملی، ویٹا کا ایک بچہ بھی تھا، اس کا بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ کیا ویٹا نے بچے کو مار دیا تھا، یا کسی یتیم خانے میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہ تھا ـــ الفریڈ نے بمبئی کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن ویٹا کہیں نہ ملی۔ الفریڈ بہت پریشان تھا۔ وہ اکثر اداس اور غمزدہ رہتا۔ ایک دن اُسے یہ خط ملا۔
نیویارک

پیارے الفریڈ
تم مجھے معاف کرو گے۔ میں ولیم کے ساتھ نیویارک چلی آئی۔ جب تم عراق چلے گئے، تو میں تنہا رہ گئی میں نے ایک دو مہینے تمہارا انتظار کیا، لیکن تم نہ آئے۔ راتیں حسین تھیں اور خوب صورت، اور میں اکیلی تھی، اور تم میرے پاس نہ تھے، اس دوران میں مجھے ولیم مل گیا۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا، کہ میرا خاوند عراق گیا ہوا ہے اس نے کہا کوئی بات نہیں، اور ہم دونوں اکٹھے گھومنے لگے، اکٹھے سینما جانے لگے، اکٹھے ناچ کرنے لگے۔ اور ایک دن ہم دونوں نے اکٹھے شراب پی لی۔ اور اس کے بعد ہم دونوں ہمیشہ کے لئے اکٹھے

ہو گئے۔ ایک بار روزی بھی ملی تھی۔ اس کی نظروں میں حقارت تھی، میں نے بہت عرصہ تمہارا انتظار کیا، لیکن تم نہ آئے، ہماری دوستی بڑھتی گئی۔ اُس پر محبت کا رنگ چڑھتا گیا۔ اور آخر میں مجھے احساس ہوا، کہ میں دلیم کو چاہتی ہوں۔ الفریڈ بُرا نہ ماننا۔ ولیم سے واقعی مجھے عشق سا ہو گیا ہے۔ جب تک ہم دونوں ہندستان میں تھے، وہ مجھ سے عشق کرتا تھا۔ اور اب جب ہم دونوں نیویارک میں آئے ہیں، میں اس سے عشق کرتی ہوں۔ پہلے وہ میرے پیچھے بھاگتا تھا، اب میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوں۔ لیکن الفریڈ — یہ سچ بات ہے کہ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی — میں اب ہندستان واپس نہیں آسکتی — مجھے افسوس ہے، کہ میں ہندستان سے چلتے وقت تمہیں اطلاع نہ دے سکی۔ اب اس لئے یہ خط لکھ رہی ہوں کہ میرے لئے تم زیادہ پریشان نہ ہو۔

تمہاری :-

ڈیٹا

جونہی یہ خط الفریڈ کو ملا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ وہ سیدھا میرے پاس پہنچا۔ اُن دنوں میں جوزف کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی جب الفریڈ میرے کمرے میں داخل ہوا، اس وقت — جوزف میرے کمرے میں موجود نہ تھا۔ اگر وہ کمرے میں موجود ہوتا، تو الفریڈ کبھی اندر آنے کی جرأت نہ

کرتا۔ الفریڈ نے مجھے واپس گھر چلنے کے لئے کہا، جب میں نہ مانی، تو اس نے مجھے ڈرایا، دھمکایا۔ وہ اس جواری کی طرح تھا، جو زندگی کی ریس میں سب کچھ ہار چکا ہو۔ گو الفریڈ اب کیپٹن بن چکا تھا، اس کی آمدنی پہلے سے کمنی ہو چکی تھی لیکن پٹے ہوئے مہرے کی طرح اس میں خود اعتمادی نہ رہی تھی۔ ویٹا کی بیوفائی نے اُسے بے دست و پا کر دیا تھا۔ وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح میری طرف لپکا۔ لیکن میں اس کے قریب رہتے ہوئے بہت دور جا چکی تھی۔ وہ مجھے پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے عراق کی فتوحات کا ذکر کیا۔ اپنی تنخواہ کا ذکر کیا۔ اپنی محبت کا رونا رویا، اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا، کہنے لگا کہ میں اب تھک کر ہار گیا ہوں، میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں، زندگی میں ایک ساتھی کی ضرورت ہے، تم مجھے جانتی ہو، مجھے اچھی طرح جانتی ہو، تم ہی مجھے زندہ رکھ سکتی ہو ـــــ واپس آ جاؤ، میری اچھی روزی۔"

لیکن اب روزی اچھی نہ تھی۔ اور میں نے اُسے صاف صاف کہا ۔ جانتے ہو تم نے مجھے اس وقت چھوڑا تھا، جب میری عمر ۱۹ برس کی تھی۔ میں اس وقت جوان تھی، مجھے اس وقت تمہاری ضرورت تھی، لیکن اس وقت تم ویٹا کو پاکر مجھے بھول گئے۔ میں مرتی رہی۔ کڑھتی رہی، سڑتی رہی، اور تم اس اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ عشق کرتے رہے۔ اس کے ساتھ سوئے۔ اُسے اپنی بیوی بنایا۔ میں نے گیارہ برس۔ تمہاری باتیں سنیں، تمہاری گالیوں کو اپنے سینے میں دبا کر رکھا۔ ویٹا کی بے ہودگیوں کو برداشت کیا۔ میں روئی، میں نے منتیں کیں، لیکن تم نہ مانے ـــــ لیکن اب کس منہ سے تم یہاں آئے ہو،

اب اس لئے آئے ہو، کہ تمہاری ڈیانتھیں چھوڑ کر چلی گئی ہے، اس نے ایک اور حسین مرد کو تلاش کر لیا ہے، اس نے ایک ایسے مرد کو ڈھونڈا ہے، جو تم سے زیادہ حسین ہے، تم سے زیادہ صحت مند ہے، تم سے زیادہ روپے کماتا ہے وہ امریکہ کا رہنے والا ہے۔ اس کی سفید چمڑی ہے اور تمھاری کالی۔ اس کا شہر نیو یارک ہے، اور تمھارا بمبئی۔ تم کالے ہو، سیاہ ہو۔ ہندستان کے باشندے ہو۔ بددماغ کیپٹن ہو۔ عیاش قسم کے آدمی ہو۔ اچھا ہوا، کہ وہ تمھیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اچھا ہوا۔ کہ اس نے تمھارے منہ پر تمھارا ہی جوتا مارا۔ تمھارے منہ پر تھوکا اب تم روؤ، جی بھر کر رو۔ لیکن میں تمھارے ساتھ کبھی نہ ہوں گی ہیں تمھارے ساتھ کبھی نہ ہوؤں گی۔ میں اب تمھاری بیوی کبھی نہ ہونگی۔ سن لیا تم نے، اب چلے جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ یہاں سے، جن قدموں سے آئے تھے، ان ہی قدموں سے واپس چلے جاؤ،،

الفریڈ یہ الفاظ سن کچھ چونک سا گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا، کہ اتنے میں جوزف اندر داخل ہوا۔ جوزف کو دیکھتے ہی، الفریڈ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ چپکے سے سیڑھیاں اتر گیا۔

کیا کہہ رہا تھا جوزف نے پوچھا

کچھ نہیں۔ اچھا ہوا کہ وہ چلا گیا۔ اب کبھی نہ آئے گا۔ اس کی جوانی یہ لے گئی تھی، لیکن بڑھاپا مجھے دینا چاہتا تھا۔ کم بخت کہیں کا،،

اور اب میں جوزف کے ساتھ رہتی ہوں، میرے بچے جوان ہو چکے

ہیں۔ ایک کی شادی ہو چکی ہے، میری عمر ۴۰ برس کی ہے، اور جوزف کی عمر ۴۹ ہے۔ ہم دونوں اکٹھے رہتے ہیں، اکٹھے کھانا کھاتے ہیں، کبھی کبھی اکٹھے شراب پیتے ہیں، میں جوزف کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں۔ اس کے کپڑے سیتی ہوں۔ اس کی گالیاں سنتی ہوں، اس کے لئے فرم میں کبھی کبھی نوکری کر لیتی ہوں۔ لیکن جوزف کو ناخوش نہیں رکھتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں بھاگ کر پہلی بار ان کے گھر گئی تھی۔ تو جوزف نے میری دیکھ بھال کی۔ اس کی ماں نے مجھے اپنی لڑکی جانا، اس کی بیوی نے میری خاطر تواضع کی۔ جوزف نے مجھے الفریڈ سے بچایا، میرا دوست، میرا سہارا بن کر رہا۔ لوگ کہتے ہیں، کہ جوزف میرا عاشق ہے، میرا خاوند ہے۔ لیکن میں آج تمھیں سچے دل سے بتاتی ہوں۔

"کہ میرا خاوند الفریڈ ہے، الفریڈ ہے، اور وہی رہے گا"۔ یہ کہہ کر، روزی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

نئے لوگ

اس دن بارش اتنے زور کی ہوئی کہ الکٹرک ٹرینیں بھی رک گئیں۔ اندھیری اسٹیشن پر مجھے ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم تھا اور سبھی لوگ بڑی بے صبری سے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے. خدا خدا کر کے ایک ٹرین اسٹیشن پہ پہونچی. سب لوگ ڈبوں کی طرف بھاگے میں بھی تھرڈ کلاس ڈبے کی طرف بھاگا۔ چونکہ ٹرین ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئی تھی اس لئے تھرڈ کا ڈبہ آن واحد میں مسافروں سے بھر گیا۔ اور اس بھاگ دوڑ میں تیسرے درجے والے دوسرے درجے میں چڑھ گئے اور کئی دوسرے درجے والے تیسرے درجے کے ڈبے چڑھ گئے. شامت اعمال ایک پارسی بھی اسی ڈبے میں چڑھ گیا. پارسی شکل وصورت سے کافی متمول دکھائی دیتا تھا۔ عموماً پارسی امیر ہوتے ہیں۔ اس کا چہرہ بھرا ہوا، سر پہ ایک گول

کالی ٹوپی، اور ایک سیاہ لمبا کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اس ڈبے میں مزدور بھی تھے، قلی بھی تھے، کلرک بھی تھے، بھیّا بھی تھے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے انسان تھے۔ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں سے ایک عجیب افسردگی ٹپکتی تھی۔ جیسے زندگی کی بہت سی خوشیوں سے محروم کر دیئے گئے ہوں۔ یہ لوگ دن رات محنت کرتے تھے خون پسینہ ایک کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے، اور جب شام ہوتی تھی تو گھر کی جانب رخ کرتے تھے۔

جب گاڑی ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پر رکی تو رکتے ہی ایک دھکا لگا۔ پارسی کو بیٹھنے کے لئے جگہ نہ ملی تھی، اس لئے وہ اس ہجوم میں کھڑا تھا جب انسان گاڑی میں کھڑا ہو تو صاف ظاہر ہے دھکا کافی زور سے لگے گا۔ پارسی کو بھی دھکا کافی زور سے لگا۔ پارسی دراصل جلد بازی میں اس ڈبے میں آ گیا تھا۔ وہ شروع ہی سے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ برانگیختہ سا ہو گیا تھا۔ اسے یہ لوگ پسند نہ تھے۔ دراصل یہ لوگ بھی عجیب تھے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے، جسم بدبودار، کوئی دھوتی پہنے ہوئے تو کوئی پھٹی ہوئی نیکر، دانت گندے اور سروں سے ننگے، پاؤں میں جوتی ندارد، اور باتیں بھی اس قسم کی کرتے تھے کہ خود بخود غصہ آ جاتا تھا۔ اب جو ٹرین کو دھکا لگا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ قریب ہی ایک مزدور کھڑا تھا۔ پارسی نے مزدور کی طرف حقارت کی نظر سے دیکھا اور چھوٹتے ہی کہا "دیکھ کر کھڑا کیوں نہیں ہوتا، دھکا کیوں دیتا ہے" پارسی کا خیال تھا کہ مزدور اس کے روپوں کا خیال کرے گا۔ اس کی عالیشان کوٹھی کا دھیان رکھے گا۔ اس کی کار کا لحاظ کرے گا۔ لیکن مزدور نے ان باتوں کا خیال نہ کیا اور کڑک کر بولا۔

، کیا بات ہے، اکڑتا کیوں ہے. جانتا نہیں یہ کونسا کلاس ہے۔ بابا۔ یہ تھرڈ کلاس ہے. یہاں تو دھکا لگتا ہے اور لگے گا. یہاں تو ہر شخص کو دھکا لگتا ہے، اس ڈبے میں بیٹھنے والے دھکوں سے ڈرتے نہیں، اگر تم دھکے سے ڈرتا ہے، تو فسٹ میں جاؤ، سکنڈ میں جاؤ، یہاں تو دھکا لگے گا۔"

مزدور کا جواب سن کر، پارسی اور بھی سٹپٹا گیا۔ پہلے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ٹوپی کو سر پر بٹھاتے ہوئے کہا: "زبان سنبھال کر بات کرو، دیکھتا نہیں ہم کون ہے، ہم جلدی سے اس روم میں چل آیا نہیں تو ہم یہاں کبھی نہ آتا۔ تم اکڑتا کیوں ہے، — اپنی عزت دیکھو، اپنا پوزیشن دیکھو، ہمارے ساتھ مقابلہ کرتا ہے اور پھر اکڑتا ہے، اور دھکا دیتا ہے۔ سیدھا کھڑا کیوں نہیں رہتا، پاؤں پر پاؤں رکھتا ہے۔ ہمارا جوتا میلا کر دیا۔ ہمارے کپڑوں کے ساتھ چمٹ کر کھڑا ہوتا ہے، اور ہمارا کپڑا خراب کر دیا۔ ذرا دور کھڑا رہ" —— یہ لمبی سی تقریر کرکے پارسی نے ڈبے کے لوگوں پر نگاہ ڈالی، تاکہ وہ اپنی شرافت اور امیری کا رُعب جما سکے، لیکن ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کی تقریر سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ وہ اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ اب مزدور کیا جواب دیتا ہے۔ مزدور نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خاموش نہیں رہے گا۔ اس نے کہا: "اے ٹوپی والے اکڑفوں کیوں دکھاتا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تمہاری جگہ نہیں ہے یہ تھرڈ کلاس ہے، یہاں غریب آدمی آتا ہے یہاں مزدور آدمی آتا ہے۔ یہاں دھکا لگتا ہے، یہاں بیٹھ کر بیٹھ لگتا ہے، یہاں آدمی زیادہ ہے جگہ کم ہے۔ یہاں جسم سے جسم لگتا ہے اور کپڑا خراب ہو جاتا ہے تم یہاں کیوں آیا۔ تم امیر آدمی ہے تم اس کلاس میں کیوں آیا۔ جاؤ اپنے ڈبے میں، فسٹ میں جاؤ

سکنڈ میں جاؤ، وہ تمہاری جگہ ہے۔ اِدھر مت ٹھہرو۔ یہاں تو دھکّا لگے گا۔

لوگوں نے مزدور کا یہ دو ٹوک جواب سنا تو سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔ قہقہہ سنتے ہی پارسی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ ڈبے والے اس کا ساتھ دیں گے۔ اس بیچارے کو واقعی دھکّا لگا تھا۔ لیکن ڈبے والے اتنے بے رحم تھے کہ انھوں نے پارسی کی باتوں کی پرواہ بھی نہ کی۔ وہ برابر ہنس رہے تھے۔ مزدور اب جوش میں آ گیا تھا۔ وہ بولا، کاہے کو شور مچاتا ہے۔ ہم غریب ہے تو امیر ہے۔ لیکن یہ ڈبّہ ہمارا ہے۔ وہ ڈبہ تمہارا ہے۔ یہاں تو دھکا لگتا ہے۔ ہم تو دھکّوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اگر تم دھکّوں سے ڈرتا ہے تو اسی وقت سکنڈ میں چلے جاؤ، رباب کیوں جماتا ہے۔ اگر ہم غلطی سے تمہارے سکنڈ میں چلے جائیں تو تم زنجیر کھینچ لیتا ہے اور ٹکٹ بابو کو بلا کر ہمیں تیسرے میں بھیج دیتا ہے۔ یہ ہے تمہاری شرافت، اب ہم کاہے کو شرافت برتیں۔ اب شرافت کا زمانہ گیا، تم ہم کو دھکا دیتا ہے، ہم تم کو دھکا دے گا۔ یہ کہہ کر مزدور پارسی کی طرف دیکھنے لگا۔ سبھی لوگ پارسی کی طرف دیکھ رہے تھے، ہنس رہے تھے۔

پارسی کو اور غصّہ آیا۔ اس نے کوٹ جھاڑتے ہوئے کہا، تم بڑبڑاتا کیوں ہے، خاموش کیوں نہیں رہتا۔ کاہے کو پوں پوں کرتا ہے۔ ہماری طرف کیوں آتا ہے ہماری بے عزتی کیوں کرتا ہے۔ ہم کو کاہے کو ستاتا ہے۔ ہمارا اتنا قیمتی کپڑا خراب کر دیتا ہے۔"

مزدور نے پارسی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ اور ڈبے والوں کو مخاطب ہو کر کہا۔ "اے بھائیو! اس بابو کی طرف دیکھو، اس کا فوٹو کھینچو۔ یہ دھکّے سے ڈرتا ہے

مزدور نے پھر قہقہہ لگایا۔ بابو۔ اس کی ٹوپی دیکھو، اس کا کوٹ دیکھو، یہ اس کی صورت ہے، کسی بھائی کے پاس کیمرہ ہو تو اس کا فوٹو اتار لو، یہ بابو ہے۔ یہ دھکّے سے ڈرتا ہے اس کے کپڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ بابو۔ کبھی کسی مل میں کام کیا، کبھی کسی فیکٹری میں کام کیا۔ کبھی کسی انجن میں کوئلہ ڈالا، کبھی جہاز کے بوائلر کے سامنے کھڑے ہو کر کام کیا۔ کبھی سڑک پر روڑی پھینکی۔ کبھی ڈیڑھ من کا بوجھ سر پر اٹھایا۔ کبھی اپنے ہاتھوں سے روزی کمائی۔ کبھی محنت مزدوری کی۔ تم تو پارسی ہو۔ بہت امیر آدمی ہو، تم تو بلیک مارکیٹ کرتا ہے اور روپے کماتا ہے۔ تم تو شراب بیچتا ہے اور بنکوں میں روپے جمع کرتا ہے تمہیں دھکوں کا کیا پتہ ہے — دھکوں کا پتہ تمہیں اس وقت لگے گا، جب تمہیں چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑے۔ جب تم ایک کھولی میں رہو، جہاں بیس آدمی رہتے ہیں اور سونے کے لئے ایک گز زمین نہیں ملتی۔ دھکوں کا علم تمہیں اس وقت ہو سکتا ہے جب مہینے میں تیس روپے ملیں اور ان روپوں سے سارے مہینے کا خرچ چلانا پڑے۔ تم دھکّوں کو کیا جانو — یہ تھرڈ کلاس کا دھکّا ہے۔ زندگی میں بڑے بڑے دھکّے کھانے پڑتے ہیں۔ ارے بھائی کسی کے پاس کیمرہ ہے۔ اس انسان کا فوٹو لے لو، ہمارے کام آئے گا۔ ہم اس فوٹو کو فیکٹری میں لگائے گا اور سب مزدوروں کو دکھائے گا۔ اور کہے گا کہ اس انسان کی طرف دیکھو، یہ انسان تھرڈ کلاس کے دھکّے سے ڈرتا ہے۔ اس کی صورت دیکھو اس کی سیرت دیکھو۔ اس کا کوٹ دیکھو! — بابا — — اگر دھکّوں سے ڈرتے تھے تو اس کلاس میں کیوں آئے، یہاں تو دھکّے ہی دھکّے ہیں واہ — بابو — اتنی جلدی دھکّوں سے ڈر گئے۔ میں پوچھتا ہوں بابو — کبھی کھیت میں ہل چلایا، گوڑائی کی، بیج بویا۔ کھیت میں پانی دیا۔ پودوں کو صاف کیا۔ کبھی گھاس کاٹی

۔ دانت ۔ دانت صاف کرنے کے لئے داتن درخت سے کاٹی، سمندر سے مچھلیاں پکڑیں۔ کیا کبھی کیکڑے پکڑتے پکڑتے تمہاری کمر دوہری نہیں ہوئی۔ کبھی لاری چلائی کلینر بنے، اخبار بیچی، جوتے میں میخیں لگائیں۔ کبھی کسی کا گھر صاف کیا۔ نالیاں پانی سے دھوئیں۔ جھاڑو دیا۔ پلیٹ فارم پر سوتے، آم بیچے۔ کیلوں کا ٹوکرا سر پر رکھ کر بازار گھومے۔ پٹری پر چیزیں رکھ کر کڑکتی ہوئی دھوپ میں کبھی چیزوں کو بیچا ۔۔ کبھی بوٹ پالش کیا، کبھی گلے سڑے آم کھائے۔ کبھی بارش میں بھیگے، کبھی تمہارے بچوں نے فاقے کئے، کبھی تمہاری بیوی تمہارے سامنے روئی کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم زیادہ پیسے کیوں نہیں کماتے، کبھی پٹھان سے ادھار پیسے لئے اور اس کے ڈنڈے کی چوٹ کو سر پر سہا۔ اس کی گالیاں سنیں۔ کبھی پولس میں گئے رپورٹ لکھائی۔ کبھی پولس مین نے تمہیں پکڑا کہ تم یہاں کیوں چیزیں بیچتے ہو۔ تمہارے پاس لائسنس کہاں ہے۔ کبھی تمہاری بیٹی بازار میں بیٹھی۔ اس نے روپے کمائے کبھی تمہاری بیوی بھاگ کر دوسرے کے پاس چلی گئی، تم نے دیکھا کیا۔ سہا کیا...... کمبخت اتنی جلدی دھکوں سے ڈر گئے ہو۔ مزدور نے اس دفعہ پھر قہقہہ لگایا۔ اور خاموش ہو گیا۔

ڈبے کے سب لوگ مزدور کی باتوں سے خوش ہوئے کہ اچھا کیا اس نے پارسی کو کھری کھری سنائیں ۔۔ سالا اچھا پھنسا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ لوگ بھی ہمیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم غریب ہیں ہم بھوکے ہیں۔ ہم ننگے ہیں۔ لیکن یم جی، آج تم نے ہماری محفل میں آکر دیکھ لیا۔ کہ ہم بھی تمہیں عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے، ہم بھی تم سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ دن ہوا ہوئے جب ہم تمہاری عزت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تم ہمارے ان داتا

ہو، ہمارے خدا ہو، ہمارے پرمیشور ہو، اب یہ جگہ ہماری ہے۔ اس پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ یہاں ہمارا انصاف ہوگا۔ یہ فوج ہماری ہے۔ پولس ہماری ہے۔ روپیہ ہمارا ہے۔ تم نے ہمیں دھکّے دے کر باہر نکالا ہے۔ ہم تمہیں دھکّے دے کر باہر نکالیں گے۔

اور لوگ پارسی کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اور پارسی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس ڈبّے سے کس طرح نیچے اترے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے گلے میں آہنی پھندا لگ گیا تھا۔ یہ واقعی اس کی جگہ نہ تھی۔ اس کی تہذیب مٹ چکی تھی، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی تھیں۔ اس کی جگہ ایک نظام لے رہا تھا۔ وہ نظام جس کی تشکیل میں مزدور کا ہاتھ ہوگا۔ اس اثنا میں ایک اسٹیشن اور آگیا۔ گاڑی رکی۔ پارسی ٹوپی سنبھالتا ہوا کمرے سے رفو چکّر ہو گیا۔ لوگ قہقہے لگا رہے، سیٹیاں بجا رہے تھے، خوش ہو رہے تھے۔

مائی ڈارلنگ ہوٹل

نمی کو دیکھتے ہی میں اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ گو یہ قابل تحسین بات نہیں کہ آپ لڑکی کو پہلی بار دیکھیں، اور اُسے دل دے بیٹھیں۔ اس حرکت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ذہنی طور پر کافی بلند نہیں۔ گو میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا، کہ میری یہ حرکت نہایت لغو ہے، نامعقول ہے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا نمی کو میں دیکھتا اور بار بار دیکھتا، اور اُسے اپنانے کی کوشش کرتا۔ یہ عجیب سی بات ہے، جب کبھی وہ مجھے ملی، اس کے لبوں پر ایک دلفریب حسین سی مسکراہٹ تھی، وہ 'ہیلو' کہتی اور قریب سے گذر جاتی، اور پانچ دس قدم آگے بڑھ کر وہ

پھر اک نگاہ غلط انداز سے دیکھتی، اور ایک لمحہ بھر کر، مسکرا کر آگے بڑھ جاتی ——
یوں وہ کئی بار مجھے ملی، اور ہیلو کہہ کر آگے چلی گئی ۔ اس نے چاہا کہ میں اُسے بلاؤں، اور میں نے یہ تمنا کی، کہ پہلے وہ مجھے بلائے، اسی امید و بیم میں چھ مہینے گذر گئے۔ عشق کی آگ سلگتی رہی، لیکن یہ عشق لیلے مجنوں کا نہ تھا، ہیر رانجھا کا نہ تھا، مرزا صاحباں کا نہ تھا۔ اس عشق میں اس بات کا ضرور خیال تھا، کہ کہیں یونہی بات بڑھتے بڑھتے نہ بڑھ جائے، زندگی وبالِ جان نہ ہو جائے، بیٹھے بٹھائے اختلاجِ قلب شروع نہ ہو جائے، اور زندگی بے کیف اور بے رنگ و بو نہ ہو جائے۔ ارے صاحب عشق کیجئے اور ضرور کیجئے، لیکن وہ عشق ہی کیا، جس میں دماغی توازن ٹھیک نہ رہے، انسان بڑبڑانے لگے، خودکشی پر آمادہ ہو جائے۔ قمیص پھاڑ کر جنگل میں نکل جائے، نوکری سے استعفےٰ دے کر معشوق کے گھر کی چوکیداری شروع کر دے —— بھائی میں اس عشق سے باز آیا۔

یوں آپ پوچھ سکتے ہیں، کہ مجھے صرف نمی ہی کیوں پسند آئی، کانتا، دنتی یا شانتا سے کیوں نہیں عشق ہوا، تو اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ نمی کو دیکھ کر آپ کانتا، دنتی اور شانتا کو ضرور بھول جائیں گے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نمی کافی خوبصورت لڑکی ہے، اور جب کبھی وہ اپنے اجلے اجلے انگ پر سبز رنگ کی ساڑھی اور سفید رنگ کا بلاوز پہنتی ہے، تو دور سے قوس قزح نظر آتی ہے۔

اس کے چہرے کے نقوش اتنے دلفریب نہیں، جتنے اس کے جسم کے نقش۔ یوں تو میں اس کے چہرے کی ہر چیز کو پسند کرتا ہوں، اس کی ناک بڑی

بھی نہیں، اور چھوٹی بھی نہیں، یعنی جسم کے پر ٹھیک لگتی ہے۔ اور آنکھیں کافی دلفریب اور حسین ہیں، اور ماتھا فراخ اور چمکدار، اور بال، نہ کالے اور نہ ہی سنہری، بس ان دو رنگوں کے درمیان کا رنگ، نہ وہ جوڑا باندھتی تھی، اور نہ ہی چوٹی، بلکہ اس کے بال کٹے ہوئے تھے، اور وہ ان کو شانوں پر بکھیر کر شان بے نیازی سے گزر جاتی تھی۔

میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ محبوب کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ اور اگر عاشق اپنے معشوق کی تعریف کرنے لگے، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ تعریف کرتا جائے گا اور زندگی بھر نہ تھکے گا ـــــ ممی کو دیکھ کر مجھے ایک بات کا ضرور احساس ہوا کہ یہ لڑکی میرے جنگل سے بچ کر نہیں جا سکتی، جنگل کا لفظ میں کسی بری نیت سے استعمال نہیں کر رہا ہوں، بلکہ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ میری شخصیت کا اثر اس لڑکی پر ضرور ہوا ہے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی، تو ممی میری طرف دیکھ کر کبھی نہ مسکراتی۔ وہ مسکراہٹ، جس میں ایک بلاوا تھا، ایک داستان عشق تھی، وہ چمکتی ہوئی آنکھیں، جو نڈر اور بیباک تھیں، جنھوں نے ہمیشہ ایک پڑھے لکھے آدمی کو اپنانے کی کوشش کی، ان آنکھوں میں ذہانت تھی، بات کو سمجھنے کا سلیقہ تھا، صرف عشق میں اپنے آپ کو تباہ کرنے کی تمنا نہ تھی، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر زندگی کو سنوارنے کی آرزو تھی۔

پہلی ملاقات جو میرے اور ممی کے درمیان ہوئی۔ وہ نہایت ہی غیر دلچسپ تھی، بمبئی میں لڑکی سے ملنا کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ اتنا بڑا شہر ہے کہ لڑکی کسی نہ کسی بہانے گھر سے نکل کے آپ سے مل سکتی ہے۔ اور اگر لڑکی اور لڑکا

دونوں عشق فرما رہے ہوں، تو آس پاس کے رہنے والے اس بات کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ آپ سمندر کے کنارے پر چلئے اس میں ملاقات کر لیجئے سینما میں مل بیٹھ کر عشق کا روزنامچہ دوہراتے رہئے، ایرانی ریسٹوران، ٹرام، ٹرین، ان سب میں آپ بڑی خوشی سے مل سکتے ہیں، ایک ایسی ہی دوپہر تھی، میں بس میں چڑھنے لگا، کہ ممی دوڑتی ہوئی بس میں بیٹھ گئی۔ میں بھی موقعہ پاکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اُس نے میرے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھی، اور پوچھنے لگی "یہ کس کی انگوٹھی ہے؟"

"مدت ہوئی ایک لڑکی نے دی تھی" میں نے جواب دیا

"کیا آپ اُسے چاہتے تھے؟"

"جی ہاں"

"وہ بھی آپ کو چاہتی تھی؟"

"جی ہاں"

"آپ نے شادی کیوں نہ کی"

"اس کی شادی ہو چکی تھی"

"مجھے افسوس ہے، آپ کے عشق پر"

"میں آپ کے افسوس کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

"کیا اب آپ کسی لڑکی سے محبت کرتے ہیں؟"

"نہیں تو"

"آپ شادی کب کرنے والے ہیں؟"

"میں شاید شادی نہ کروں"

ممی نے میری طرف دیکھا، وہ میرے قریب سے ذرا دور کھسک گئی اور جب بس ٹھہر گئی۔ تو وہ اتر گئی۔

یہ ملاقات نہایت ہی فروعی اور بے جان تھی۔

اور اس ملاقات کے بعد پھر وہ مجھے ایک اسٹوڈیو میں ملی، مجھے اور اسے ایک ہی پکچر میں کام کرنا تھا۔ شوٹنگ کے دوران میں وہ اکثر مجھ پر فقرے کستی، اور میں اکثر خاموش رہتا، میری خاموشی اکثر اُسے اُداس کر دیتی۔ شاید اُسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں اُس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے وہ اتنا عرصہ مجھ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ میں بھی یونہی خاموش رہا، خاموش رہنا، میری عادت بن چکی ہے۔ اور اس عادت نے مجھے کافی نقصان پہنچایا ہے۔ کسی نے مجھے گالی دی، میں خاموش رہا، کسی نے بے عزتی کی، اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ اس سے لڑنے میں کیا فائدہ ہے۔ کسی نے قرض مانگا، میں نے دے دیا، لیکن اس سے دوبارہ روپے نہ مانگ سکا، اور اسی طرح کسی لڑکی نے بات کی، تو میں نے بات کا جواب دے دیا۔ کسی نے دیکھا، تو میں نے اُسی طرح جھانک کر دیکھ لیا کسی نے محبت کا اظہار کیا تو میں نے بھی محبت کا فلسفہ چھیڑ دیا ——— اور اب جب ممی سے دوبارہ ملاقات اسٹوڈیو میں ہوئی، تو پرانی باتیں یاد آ گئیں، ممی نے مجھے دیکھا، اور میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"آپ!" میرے منہ سے نکلا

"جی ہاں"

"یعنی آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟"

"میں کچھ سننا چاہتی ہوں"

"تو پہلے آپ ہی کہئے"

"آپ کافی خوبصورت دکھائی دے رہے ہیں"۔ منی نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ میک اپ مین کی مہربانی ہے"

"میرے کہنے کا یہ مطلب ہے، کہ میں آپ کو چاہتی ہوں" وہ یہ الفاظ کہہ کر ہنسنے لگی۔

"میں بھی آپ کو چاہتا ہوں" ۔ میں نے مسکرا کر کہا

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں"

"آپ بھی جھوٹ بول رہی ہیں"

"میں آپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے واقعی آپ سے محبت ہے"

"میں بھی آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں، کہ مجھے واقعی آپ سے محبت ہے"

"آپ نے اس سے پہلے اس بات کا اظہار کیوں نہیں کیا؟"

"اور آپ نے اس سے پہلے کیوں نہیں محبت کا اظہار کیا؟"

"میں نے سنا ہے کہ آج کل آپ بہت عیش کرتے ہیں ——— ایک

موٹی بھدی سی لڑکی کے ساتھ "
"میں نے سنا ہے، کہ آپ آجکل ایک موٹے، بھدے، لوفر کے ساتھ عشق فرما رہی ہیں "
"یہ بہتان ہے!"
"اور جو کچھ آپ میرے متعلق کہہ رہی ہیں، وہ بھی سفید جھوٹ ہے"
پھر ہم دونوں پردے کی آڑ میں چلے گئے۔
"یہاں خاموشی ہے" ممی نے کہا "یہاں کوئی بھی نہیں، یہاں روشنی بھی نہیں "
"ڈائریکٹر نہیں، ایکٹر نہیں، لائٹ بوائے نہیں، میک اپ مین بھی نہیں "
"بیٹھ جائیے" ممی نے بیٹھتے ہوئے کہا
میں بیٹھ گیا۔
"یہاں ہم دونوں ہیں"
چھت پر سے ایک کبوتر نے غٹرغوں کی،
"جی ہاں ۔ ہم دونوں ہیں"
وہ میری جانب دیکھنے لگی ۔ اور پھر شرما گئی، اس نے اپنی ٹھوڑی اپنے گھٹنوں پر رکھ دی ۔
میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں صاف اور نرم ۔ اس کی انگلیاں میرے ہاتھوں میں کانپ رہی تھیں ۔ میں نے اس

کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے، اُس نے میری طرف پھر دیکھا۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور پھر کہنے لگی۔

"اگر کسی نے دیکھ لیا، تو؟"

"تو ہم کہیں گے، کہ ریہرسل کر رہے تھے۔"

"کس بات کی؟"

"اس کھیل کی"

"کس کھیل کی؟"

"یہی کھیل، جو اس وقت کھیلا جا رہا ہے"

"یعنی آپ کو یقین نہیں آتا، عجیب سی بات ہے، کہ آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آتا"

وہ ہنس پڑی

"ہنسنے کی کوئی بات نہیں تھی"

"لیکن آج میں بہت خوش ہوں —— بہت خوش —— تمہاری قسم بہت خوش ہوں"

"مجھے پاکر، یعنی مجھ سے مل کر؟" میں نے فتح اور کامرانی کے انداز میں پوچھا۔

"نہیں تو"

"تو پھر؟"

"تمہارے ڈائلاگ سن کر"

"یعنی آپ میری ڈائلاگ کا مذاق اڑا رہی ہیں"۔

"نہیں صاحب۔ میرا اشارہ اُس ڈائلاگ کی طرف ہے، جو آپ نے سٹ پر بولی تھی"۔

"شکریہ اس ہمت افزائی کا"۔ اور میں اس کے اور قریب ہو گیا۔

"اگر کوئی آ گیا تو؟"

"آنے دو، ہم چپ چاپ بیٹھے ہیں"

"لیکن"

"لیکن کیا ؟"

"بات یہ ہے کہ اگر لوگوں نے کچھ اور سمجھ لیا تو؟ ——— میں کہتی ہوں لوگ کیا سمجھیں گے؟"

"کیا مطلب"

"آپ بالکل بدھو ہیں"۔ اور وہ ہنس پڑی۔

یہ ہنسی خوبصورت تھی، آواز میں جاذبیت تھی، نسائیت تھی۔ اس ہنسی میں کنول کے پھول تھے، اس ہنسی میں شہنائی تھی، ڈھولک کے گیت تھے، چنبیلی کے ہار تھے۔ اس ہنسی میں کیا کچھ نہ تھا۔ وہ ہر چیز اس ہنسی میں تھی، یہ ہنسی زندگی تھی۔ دور چاند مسکرایا۔ سکھیاں کھلکھلا اٹھیں، اور اس جھرمٹ میں ممی نے اپنی سحر انگیز آنکھیں کھولیں، اور ایک بچہ مسکراتا ہوا ہم دونوں کی طرف لپکا۔

بچے کا تصور ذہن میں آتے ہی میں کانپ گیا۔ اور یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟"

"سٹ پر کام ہے"

اور ہم دونوں اُس جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے

اب ہر چیز صاف تھی، عیاں تھی، محبت کا جذبہ بے نقاب ہو چکا تھا بنی میرے پاس تھی، میرے قریب تھی، میں اسے چاہتا تو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیتا۔ لیکن اتنی طاقت نہ تھی، سکت نہ تھی، ایک عجیب سی کش مکش تھی دل میں ایک چھند تھا، جو رہ رہ کر پکار رہا تھا ـــــ یوں مت بڑھو، سوچ لو، سمجھ لو، زندگی سے یوں کھیلنا درست نہیں ـــــ لیکن یہ بات سچ تھی کہ وہ مجھ سے دور نہ رہ سکتی تھی، جیسے یہ قسمت کا اٹل فیصلہ تھا کہ وہ میرے قریب سے ہو کر گزرے گی۔ وہ میری زندگی میں ضرور داخل ہو گی ضرور ہو گی۔ اور یہی ہوا۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔

ماحول کافی رومنٹک تھا

محبت ہو سکتی تھی

سامنے پھیلی ہوئی جھیل تھی، اور اس کے اردگرد ناریل کے لانبے لانبے درخت

جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے وہاں کوئی نہ تھا۔

قریب جھاڑیاں تھیں

جھاڑیوں میں پھول لگے ہوئے تھے

نمی میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی، اس نے میک آپ کیا ہوا تھا اس لئے وہ کافی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، اس کے لبوں پر لپ سٹک تھی، وہ اپنی زبان لبوں پر پھیرتی، اور لبوں کو اور چمکا لیتی، نگاہوں میں پیار تھا قریب ہی سے کٹ اور اسٹارٹ کی آوازیں آرہی تھیں، کبھی کبھی ڈائریکٹر کے قہقہوں کی آوازیں آتیں، اور پھر فضا میں خاموشی طاری ہو جاتی۔

جھیل پر سورج کی کرنیں ناچ رہی تھیں، ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا آتا، اور پانی میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا، ننھی ننھی لہریں، ساحل کے قریب دوڑنے لگتیں، دور آسمان میں پرندے اڑ رہے تھے، اور کبوتروں کا جوڑا، سامنے درخت پر محبت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا۔

"نمی"

"جی"

"تم چپ کیوں ہو"؟

"مجھے یہ جگہ اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے، کہ میں اکیلی جنگل میں چلی جاؤں، جہاں صرف گھنا جنگل ہو، اور کوئی نہ ہو، صرف گہرا اندھیرا ہو۔ بڑے بڑے درخت ہوں، اور پھیلے ہوئے سائے، اور ان سایوں کی آغوش میں اپنے آپ کو حوالے کر دوں"

"شاعری کر رہی ہو"

"نہیں"

"مجھے واقعی گھنے جنگل سے محبت ہے"

"اور کسی سے نہیں؟"

اور وہ شرما گئی۔

میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر نگاہ ڈالی، اور اس کے بعد یکایک اس کے سرخ سرخ لبوں کو چوم لیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" وہ کرخت لہجے میں بولی

"جو کچھ میں نہیں کرنا چاہتا تھا"

"پھر آپ نے یہ حرکت کیوں کی؟ یہ اچھا نہیں کیا آپ نے"۔ اور وہ شرما گئی۔ اور اپنے چہرے کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔

میں نے دوبارہ اُسے چومنے کی کوشش کی

"دوبارہ ایسی حرکت نہ کیجئے گا" لمی نے چمک کر کہا۔

"اگر آپ زیادہ اس مسئلے پر بحث کریں گی، تو مجھے دوبارہ آپ کا منہ چومنا پڑے گا"

"آپ کو شرم نہیں آتی؟"

"نہیں تو"

"مجھے آپ سے شرم آتی ہے"

"کوئی بات نہیں"

"آپ بہت بے شرم ہیں"
"ہونا پڑتا ہے"
"مجھے آپ سے یہ ہرگز امید نہ تھی"
دور سے کسی کی آواز آئی۔
"شاید ہمیں بلایا جا رہا ہے، آؤ چلیں"
میں نے کہا "اگر ڈائریکٹر کو یہ معلوم ہوگیا، کہ ہم دونوں عشق فرما رہے ہیں، تو وہ دونوں کو کمپنی سے نکال دے گا"
یہ فقرے سن کر وہ ہنس پڑی۔
"کیا بات ہے؟"
"تم بالکل بدھو ہو" وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی
اس کے بعد میری اور ممی کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں، کچھ چھپی چھپی، کچھ گھٹی گھٹی۔ جن میں بوسے زیادہ اور محبت کم، ممی سے مل کر مجھے ہر بار یہی احساس ہوتا، جیسے اس محبت میں خلوص کم ہے، پیار کم ہے، جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف یونہی کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ اور اب جب کبھی محبت کے موضوع پر بحث چھڑتی، تو میں بڑی شان سے کہتا کہ "میں تمھیں چاہتا ہوں، صرف تمھیں چاہتا ہوں"۔ وہ میری باتوں کا یقین کرتی تھی یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں، لیکن اس کے لبوں پر ہمیشہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ ہوتی، وہ مسکراہٹ جو اس بات کی غمازی کرتی تھی، کہ میں تمھارے متعلق سب کچھ جانتی ہوں، تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔

زندگی اگر صرف بوسوں پر ختم ہو جاتی ۔ تو کوئی بات نہ تھی
ایک دن میں نے نی سے کہا " مجھے اس قسم کی ملاقاتیں اچھی نہیں لگتیں "
"کیوں، کیا برائی ہے، ان ملاقاتوں میں ؟"
"میرا جی چاہتا ہے، اگر ملیں، تو جی بھر کر ملیں، یہ بھی کیا ملنا ہوا، کبھی اسٹوڈیو میں ـــــ کبھی اُس جھاڑ کے پیچھے ۔ کبھی اس کار کی آڑ میں، تو کبھی پردے کے پیچھے
"آپ کہاں ملنا چاہتے ہیں ؟"
"باہر"
"باہر کہاں ؟"
"اس شہر سے دور "
"اگر گھر والوں کو علم ہو گیا ؟"
"تو تم گھر والوں کو چھوڑ دینا "
"اور آپ مجھے اپنے پاس رکھیں گے " وہ ہنس پڑی
"تو کل آؤ گی ؟"
"کہاں ؟"
"اُس موڑ پر "
"آؤں گی "
"اگر نہ آنا ہو، تو وعدہ نہ کرو "
"بابا، آؤں گی اور ضرور آؤں گی "

دوسرے دن وہ وقت مقررہ پر پہنچ گئی۔ شام کا وقت تھا، اور سورج غروب ہو چکا تھا۔ ٹیکسی آہستہ آہستہ آبادی سے گذرتی ہوئی ایک غیر آباد علاقے میں داخل ہوتی گئی، اب مکان وغیرہ کچھ نہ تھے۔ سڑک کے دونوں طرف درخت ایستادہ تھے، اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ میرے اور قریب ہو گئی۔

"کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

"اس جنگل میں"

"کیا آپ کو جنگل میں ڈر نہ لگے گا؟"

"تم نے ایک دن کہا تھا، کہ تمھیں گھنا جنگل اچھا لگتا ہے"

ٹیکسی ایک جگہ پر آ کر رک گئی۔ سامنے گھنا جنگل تھا۔ اور ساتھ پھیلا ہوا سمندر۔

"یہ جگہ بہت اچھی ہے، یہاں کوئی بھی نہیں۔ صرف اندھیرا اور جنگل اور سمندر۔ یہاں انسان ہیں، نہ خونخوار جانور۔ صرف اندھیرا۔ سمندر۔ اور جنگل"

"عجیب سی بات ہے کہ مجھے گھنا جنگل اچھا لگتا ہے"، منی نے یہ الفاظ رک رک کر کہے۔

ہم دونوں جنگل میں داخل ہو گئے۔ لانبے لانبے درخت تھے، اور پھیلا ہوا سیاہ اندھیرا۔ منی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور کہنے لگی۔

"آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔ بس اور آگے نہیں جائیں گے"

"کیوں آگے جانے سے ڈرتی ہو؟"

"ہاں بابا۔ اب اس سے آگے اور کہاں جاؤ گے۔ آؤ، یہیں بیٹھ جائیں، دیکھو، ریت، کتنی نرم اور ملائم ہے"

"ہاں۔ ریت کتنی نرم اور ملائم ہے، اور دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور پھیلا ہوا جنگل۔ اور یہ لانبے لانبے درخت، اور یہ بڑے بڑے پتے، اور نرم ملائم ریت"

"آؤ بیٹھ جائیں"

"دیکھو، یہ جگہ گیلی نہ ہو۔ ٹھہرو۔ میں رومال بچھائے دیتا ہوں"

"شکریہ"

"یہاں کتنا سکون ہے"

"یہاں کتنی خاموشی ہے"

ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ اور پتوں سے سرسراتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ساتھ ہی سمندر اپنا وحشی راگ گا رہا تھا۔ لیکن اس جنگل کی پھیلی ہوئی خاموشی، سمندر کے وحشی راگ سے بہت گہری تھی۔ لہریں بڑی چٹانوں سے ٹکرائیں۔ اور پھر واپس چلی جائیں۔ اور ان کے پیچھے، سمندر کی جھاگ، چٹانوں سے پھٹ جاتی لیکن اس وحشی جنگل میں نہ جھاگ تھی، نہ لہریں تھیں، صرف ایک پھیلی ہوئی خاموشی، ایک پھیلا ہوا اندھیرا، اور کبھی کبھی سرسراتی ہوئی ہوا۔

اور ہم دونوں ریت پر بیٹھ گئے۔ زمین کہیں کہیں گیلی اور ٹھنڈی تھی ہوا کے جھونکے نمی کی شلوار اور میری پینٹ سے اُلجھ رہے تھے، اوپر آسمان صاف اور شفاف تھا۔ ابھی تک چاند نہ نکلا تھا۔ صرف مغرب میں ایک د

ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہم دونوں اکیلے تھے، اور میں چپکے سے اوندھے منہ ریت پر لیٹ گیا۔ اور بنی کی طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

بنی کی نگاہیں کچھ چنچل تھیں، کچھ شوخ تھیں۔ لیکن کہیں کہیں سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بنی کہنے لگی "مجھے یہ جگہ اچھی لگتی ہے"۔ اور وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

پھر نرم نرم ریت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "میں ہوٹلوں میں جانا پسند نہیں کرتی"

"یعنی تم ہوٹلوں میں جا چکی ہو؟"

"بمبئی بہت بڑا شہر ہے" اس نے نگاہ پھیر کر کہا

"کیوں نہیں"۔ میں نے جواب دیا "تم میرے قریب آجاؤ"

"مجھے تم سے ڈر لگتا ہے" بنی نے رکتے رکتے کہا

"تم کس ہوٹل میں گئی تھیں؟"

"تاج میں"

"کس کے ساتھ؟"

"اپنے بھائی کے ساتھ"

"اور پھر؟"

"گرین میں"

"کس کے ساتھ؟"

"اپنے بھائی کے ساتھ"

"اور کس کس ہوٹل میں گئی ہو؟"

"مائی ڈارلنگ ہوٹل میں"

"وہاں بھی جا چکی ہو؟" ۔ میں نے چونک کر پوچھا

"کیوں ۔۔ وہاں کیا ہے؟"

"وہاں تو طوائفیں جاتی ہیں"

"میں تو اپنے بھائی کے ساتھ گئی تھی"

"اور کہاں کہاں گئی ہو؟"

"کافی ہاؤس، پیریشین ڈائری ۔ اسٹوریہ ۔ وٹز ۔ جوہو ہوٹل"

"یعنی تم بمبئی کے ہر ہوٹل میں جا چکی ہو، اپنے بھائی کے ساتھ؟"

"تم اسے مذاق سمجھتے ہو؟"

"نہیں تو ۔ مجھے صرف حیرت ہے، مجھے یقین نہیں آتا ۔ تم اتنی سی عمر میں اتنے ہوٹلوں میں جا چکی ہو ۔ اور میں اتنا بڑا ہو کر بھی تاج اور گرین میں نہ جا سکا ۔ تم نے اتنی سی عمر میں اتنی باتیں سمجھ لی ہیں، دیکھ لی ہیں"

"تمھارا مطلب؟"

"کچھ بھی نہیں"

"میں یونہی بھائی کے ساتھ چلی جاتی ہوں"

"وہاں کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں، صرف گپیں ہانکتے ہیں، کبھی کبھی چائے پیتے ہیں ۔ کھانا کھاتے ہیں، اور پھر واپس چلے آتے ہیں"

"گیبیں کس کے ساتھ ہانکتی ہو؟"

"لوگوں کے ساتھ"

"وہ کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"شریف آدمی — خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں، کسی نے بش شرٹ پہنی ہوتی ہے۔ تو کسی نے شارک اسکن کا سوٹ۔ اور کبھی کبھی بمبئی کے سیٹھ آتے ہیں۔ موٹے، بھدے، بدصورت۔ اور کبھی کبھی گاندھی ٹوپی والے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ تم عجیب سی باتیں پوچھتے ہو: یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ اور میرا ہاتھ دبا دیا۔ اور ساتھ ہی کہنے لگی "کیا تم مجھے چاہتے ہو؟"

سوال ٹیڑھا تھا۔

"اور پھر کتنا اندھیرا ہے، اور مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ یہاں کوئی چور نہ آجائے"

اور وہ میرے اور قریب ہو گئی۔ اور اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔ اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

یہاں واقعی اندھیرا ہے۔ اور واقعی چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا، گہرا ہو چکا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں اندھیرے میں غرق ہو گئی تھیں، صرف زمین گیلی اور ٹھنڈی تھی۔ ریت ملائم اور نرم تھی، اور اوپر آسمان نیلا اور گہرا تھا۔ اب ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اور لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں، اور سمندر کی جھاگ ہانپتی، شور مچاتی، چٹانوں کے اردگرد چکر لگا رہی تھی،

زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ ناک کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی: اور ہوا بوریاں دبی ہوئی قریب سے گذر رہی تھی۔

"مجھے اپنا سر رکھنے دو"

"کہاں پر؟"

"اپنے سینے پر"

"رکھ لو"

اور اُس نے اپنا سر میرے سینہ پر رکھ دیا۔ اور پھر اپنا ہاتھ میرے سینے پہ رکھ دیا۔

"اوہ۔ تمھارے سینے پر بال ہیں۔ میرے سینے پر تو کوئی بال نہیں، تمھارا سینہ مضبوط ہے، سخت ہے، کھردرا ہے" میری قمیص کے بٹن کھول دیئے اور میرے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی "تمھاری چھاتی مجھے اچھی لگتی ہے، کھردرے سینے پر کھردرے بال"

اور میں اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا تنفس تیز چل رہا تھا۔ اور پھر وہ یکایک بول اٹھی "چلو، گھر چلیں۔ بھیا میرا انتظار کر رہے ہوں گے، اگر انھیں اس بات کا علم ہوگیا۔ تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا ہے۔ میں کہہ کر آئی تھی کہ میں اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں ـــــ اب اٹھو چلیں"

"ٹھہر جاؤ ـــــ"

"چلو ـــــ گھر چلیں"

"یہ اندھیرا کتنا اچھا ہے"

"مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے"

"تو پھر"

"کچھ بھی نہیں"۔ وہ ہنس پڑی

میں نے اُس پھیلے ہوئے اندھیرے میں اس کے لبوں کو چوم لیا۔

مائی ڈارلنگ ہوٹل

اندھیرا

تاج محل

اندھیرا

گرین

اندھیرا

اسٹوریہ

اندھیرا

یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ یہاں تو تمھارا بھائی بھی نہیں، دماغ میں مختلف قسم کے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ اور جب تم گھر سے باہر نکلی تھیں۔ تو تمھارے بالوں میں پھول لگے ہوئے تھے۔ اُس وقت تمھارے بھائی نے تم سے کچھ نہیں کہا تم سے یہ نہ پوچھا، کہ تم کہاں جا رہی ہو ــــ جب تم گھر سے نکلی تھیں، تو نہا دھو کر نکلی تھیں۔ آئینے کے سامنے ضرور کھڑی ہو کر بالوں میں کنگھی کی ہوگی۔ منہ پر ہلکا سا پوڈر لگایا ہوگا۔ اور لبوں پر ہلکی سی سرخی ــــ ٹرنک سے ریشمی کپڑے نکالے

ہو گئے۔ اُس وقت تمھارا بھائی کہاں تھا۔ ہاں۔ تم اپنی سہیلی سے ملنے جارہی تھیں۔ تم شاید ہر شام اپنی سہیلی سے ملنے جاتی ہو — نہیں، شاید — نہیں شاید تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ بھی ہو سکتا ہے اور دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا، کہ تم شام کے وقت، اس اجاڑ، گھنے جنگل میں ایسی تنہا، ایک انسان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔ گھر دور ہے، بھائی دور ہے، آبادی آس پاس نہیں۔ انسان کی بو تک نہیں آرہی ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں، نہ تھانہ، نہ حوالات، نہ جج، نہ پولیس۔ یہاں تو سب کچھ ہو سکتا ہے یہاں کوئی قانون نہیں، صرف جنگل کا قانون ہے، جنگل کا وحشی قانون ہے۔ جو صرف میری اور تمھاری آواز سنتا ہے۔ جو یہ نہیں پہچانتا کہ تم کون ہو، اور میں کون ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں، کہ تم مجھے پہچانتی ہو، اور میں تمھیں پہچانتا ہوں۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں تم سے محبت کرتے ہوئے ایک دوسری لڑکی کے ساتھ سوتا ہوں، اور تم مجھ سے محبت کرتے ہوئے، دوسرے آدمیوں کے ساتھ سیر کرنے جاتی ہو۔ ہوٹلوں میں جاتی ہو، گرین تاج، مائی ڈار لنگ ہوٹل — ان سب میں جاتی ہو۔ وہاں کیا ہوتا ہے۔ تمھیں ڈر لگتا ہے، وہاں ڈر کس بات کا — وہاں روشنی ہوتی ہے، شراب ہوتی ہے ناچ ہوتا ہے۔ لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، خوبصورت عورتیں، رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس، اپنے عاشقوں کا انتظار کرتی ہیں۔ لیکن وہاں بد صورت عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ وہ عورتیں، جن کا شباب لٹ چکا ہوتا ہے، جن کے

چہرے پر جھریوں نے ایک جال بچھا دیا ہے۔ جن کے کولھے پھیل گئے ہیں۔ اور گوشت لٹک گیا ہے۔ لیکن شراب کی حدت ابھی ان کے چہروں کو تمتمائے رکھتی ہے۔ جھریاں اُس پوڈر کی تہ میں چھپ جاتی ہیں۔ اور کریم سے جلد زیادہ ملائم۔ اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہاں روشنی ہوتی ہے، آنکھوں میں کیا چمک ہوتی ہے، نشہ ہوتا ہے۔ زندگی ہر قید سے آزاد ہوتی ہے۔ تم ہو۔ میں ہوں کوئی بھی نہیں۔ نہ میں اور نہ تم —— لیکن کبھی کبھی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے، کہ تم سب کچھ دیکھ سکتی ہو۔ کہ دوسرے کی آنکھوں میں کیا ہے۔ اُن میں کتنی بے حیائی ہوتی ہے۔ کتنی بدصورتی ہوتی ہے۔ کتنی کمینگی ہوتی ہے۔ اور چونکہ تم ذہین ہو، معصوم ہو —— اس لئے تم برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور اسی لئے تم روشنی سے بھاگ کر اس گھنے جنگل کی طرف رُخ کرتی ہو —— ایک غیر آباد علاقے میں —— یہاں تمہارا بھائی بھی نہیں —— ، تم کہاں ہو، میں کہاں ہوں، صرف اندھیرا ہے اور تم ہو —— یہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، تم بھی ننگی ہو، اور میں بھی ننگا ہوں، اور درمیان میں اندھیرا ہے۔ تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔ میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا —— اور یہ رات، یہ جواں سال رات —— اور یہ پھیلا ہوا اندھیرا —— اور یہ سمندر، اور یہ چٹانیں۔ اور یہ لہریں —— اور یہ درخت لانبے لانبے —— اور ریشمی ریتا —— اور سوندھی سوندھی خوشبو —— یہ سب روشنی کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں —— تم میرے اتنی قریب ہو، کہ تمہارا بھائی اس وقت کچھ نہیں کر سکتا —— تم اچھی ہو، تم خوبصورت ہو، تم بدصورت ہو، لیکن میری ہو —— تمہاری

باہیں میری ہیں، اور تم میری ہو۔ تم کالی ہو، گوری ہو۔ کانی ہو، گنجی ہو لیکن اس وقت میری ہو۔ تم اندھیرے کی ہو۔ اندھیرا جو تم میں اور مجھ میں ہے جو ہم دونوں کو یہاں لایا۔ تم۔ جو اس سے زیادہ صحت مند ہو سکتی ہو۔ ان بازوؤں پر اور بھی گوشت آ سکتا ہے، یہ جسم اور بھی خوبصورت ہو سکتا ہے —— ہاں —— ہاں —— تمہارے ہونٹ اچھے ہیں۔ نرم ہیں، گرم ہیں۔ لیکن یہ بوسہ - یہ عجیب بوسہ ہے۔ یہ پہلا بوسہ نہیں۔ یہ چومنے کا انداز نیا نہیں۔ اس میں مشق کی بو آتی ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں —— تمہارے چومنے کا انداز —— تمہاری باتیں —— یہ تمہاری مسکراہٹ تمہارا —— یہاں اکیلی آنا —— کیا یہ سب کچھ دھوکا ہے۔ اور اگر یہ دھوکا نہیں —— تو کیا ہے ——؟

"چلو گھر چلیں"

"اب کیا کرو گی جا کر"

"بھائی انتظار کر رہا ہو گا۔ اگر اُسے پتہ چل گیا۔ تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گا"

"تم میرے پاس ٹھہرنا"

وہ ہنس پڑی۔

اندھیرا بہت بڑھ چکا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم کار کے قریب پہنچے۔

دونوں کار میں بیٹھے، کار چلتی رہی، اور بنی میرے ساتھ چمٹی رہی، اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔

اس کا گھر قریب آ گیا۔ وہ کار سے نیچے اتری اور گھر کی طرف چل پڑی۔

دو دن کے بعد میں اس کے گھر پھر گیا۔ منی، بستر پر لیٹی ہوئی تھی، اور کراہ رہی تھی، میں چپکے سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا"

"کچھ نہیں"

"تمہارا چہرہ کیوں سُوج گیا ہے"۔ اس کے دائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"بھائی نے پیٹا ہے"

"کیوں؟"

"اُس رات جو تمہارے ساتھ گئی تھی"

"اور اُس سے پہلے بھی تو تم جاتی تھیں۔ اُس رات ہی اُس نے تمہیں کیوں پیٹا"

"جب کبھی میں باہر جاتی تھی، اُس سے پوچھ کر جاتی تھی۔ اور جس کے ساتھ جاتی تھی، اُسے معلوم ہوتا تھا۔ اب کے میں نے نہ اُس سے پوچھا۔ اور نہ ہی اُسے معلوم ہوا۔ سمجھ گئے تم"

وہ پھر کراہنے لگی ——— اتنے میں اس کا بھائی داخل ہوا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا منی کو"

"گر پڑی تھی"۔ بھائی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ اور دوسرے کمرے

میں چلا گیا۔

بنی نے میری طرف دیکھا۔ اور کچھ نہیں کہا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور کچھ نہیں کہا۔ اور میں چلا آیا۔

اُس واقعہ کے بعد میرا اور بنی کا ملنا کم ہوتا گیا ——— میں اُسے سمجھ گیا، اور وہ مجھے سمجھ گئی۔ کچھ اس کی مجبوریاں تھیں، کچھ میری ——— اب جب کبھی وہ ملتی، تو چپ چاپ اور خاموش رہتی۔ باتیں بہت کم ہوتیں۔ نہ شکوے، نہ شکایتیں اب میرے اور اس کے درمیان اندھیرا نہ تھا۔ بلکہ اُس کا بھائی ایک عظیم چٹان کی طرح کھڑا تھا ——— بات بنتی تو کیا بنتی ——— نہ شادی ——— نہ محبت ——— صرف ملاقات ——— محبت اور شادی، میں نے سوچا، محض بکواس ہے ——— یہاں نہ شادی ہے، نہ محبت، صرف مائی ڈارلنگ ہوٹل ہے ———

زیر طبع

خون کی لکیر	نظمیں	سردار جعفری
میں کون ہوں؟	کہانیاں	خواجہ احمد عباس

ہماری دوسری کتابیں

سمندر دور ہے	کہانیاں	کرشن چندر

قیمت دو روپیہ بارہ آنے

... اور انسان مرگیا	ناول	راماننددساگر

قیمت چار روپے

کلنک	کہانیاں	سرلا دیوی

قیمت دو روپیہ بارہ آنے

نو ہند پبلشرز لمیٹڈ

۱۰۳۔ عبدالرحمن اسٹریٹ بمبئی ۳